اپریل ۱۹۹۰ء

ماہنامہ حکمتِ قرآن لاہور

مدیر مسئول
ڈاکٹر اسرار احمد

حرفِ اوّل	عاکف سعید	۲
ہدایت القرآن (۳۷)	مولانا محمد تقی امینی	۵
کاروانِ حدیث (۶)	عبدالرشید عراقی	۸
لغات و اعرابِ قرآن (۱۱)	پروفیسر حافظ احمد یار	۱۳
"قرآن حکیم قرنِ اوّل میں اور اس کے بعد" - ایک بلیغ اشارہ	ڈاکٹر ظہور احمد اظہر	۳۳
تحریکِ دعوت الی القرآن	ڈاکٹر محمد یوسف گورایہ	۴۳
دعوت الی القرآن - چند تاثرات	چوہدری مظفر حسین	۵۳
اسلام کا سیاسی نظام - ۲ (بسلسلہ ڈاکٹر طاہر سعید کے نام)	ڈاکٹر حافظ محمد مقصود	۶۲

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

نزولِ قرآن کے مبارک مہینہ میں

جبکہ نیکیوں کا ثواب ستّر گنا ہو جاتا ہے

علم اور دعوتِ قرآن

کے فروغ اور اشاعت میں کچھ پیسہ صرف کر کے

اپنے اعزّہ و اقارب اور رفقاء و احباب کو کتابوں کا ھدیہ پیش کریں

جس سے آپ کا اجر و ثواب تو یقینی ہے ہی،

کیا عجب کہ کسی کی زندگی کا رُخ بھی بدل جائے

اور اس طرح آپ کے لیے صدقۂ جاریہ کی صورت بن جائے!

(۱)

ڈاکٹر اسرار احمد کی شہرۂ آفاق تالیف:

"مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق"

کا اعلیٰ ایڈیشن۔ (فی نسخہ۔/۸) بیس بیس نسخوں کے پیکٹ، فی پیکٹ۔/۱۰۰

(بقیہ تفصیل ٹائیٹل کے اندرونی صفحہ ۳ پر دیکھیں)

وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا

(البقرہ: ۲۶۹)

36

ماهنامه

حکمتِ قرآن

لاهور

جاری کردہ: ڈاکٹر محمد رفیع الدین، ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ، مرحوم

مدیر اعزازی: ڈاکٹر ابصار احمد، ایم اے، ایم فل، پی ایچ ڈی،

معاون مدیر: حافظ عاکف سعید، ایم اے (فلسفہ)

معاون امور انتظامی: حافظ خالد محمود خضر

جلد: ۹ | اپریل ۱۹۹۰ء ـ رمضان المبارک ۱۴۱۰ھ | شمارہ: ۴

ـــ یکے از مطبوعات ـــ

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۳۶ ـ کے ـ ماڈل ٹاؤن ـ لاہور ۱۴ ـ فون: ۸۵۶۰۰۳

کراچی آفس: اداود منزل متصل شاہ بکری، شاہراہ لیاقت کراچی فون: ۲۱۶۵۸۶

سالانہ زر تعاون ۴۰ روپے فی شمارہ ۴ روپے

مطبع: آفتاب عالم پریس، ہسپتال روڈ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ اوّل

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے زیر اہتمام سالانہ محاضرات قرآنی کا انعقاد اس سال بھی حسبِ سابق مارچ کے خوشگوار مہینے میں ہوا۔ ۱۹، ۲۰ اور ۲۱ مارچ کی تاریخیں محاضراتِ قرآنی کے لیے طے تھیں۔ انہی ایام میں تنظیم اسلامی کے پندرہویں سالانہ اجتماع کا پروگرام بھی ترتیب دیا گیا تھا۔ تنظیم اسلامی کے اجتماعات کے لیے صبح کے اوقات اور محاضراتِ قرآنی کے پروگراموں کے لیے شام کے اوقات مخصوص کیے گئے تھے۔ الحمدللہ کہ علمی و فکری اور تنظیمی و تحریکی افادیت کے حامل یہ دونوں پروگرام طے شدہ شیڈیول کے مطابق اللہ تعالیٰ کی تائید و توفیق سے بحسن و خوبی منعقد ہوتے۔ سطور ذیل میں ان اجتماعات کی تفصیلی رپورٹ پیش کرنا مقصود نہیں ہے، تنظیم اسلامی کے اجتماع کی اجمالی رپورٹ تو ماہنامہ 'میثاق' کے تازہ شمارے میں شائع ہو ہی چکی ہے، تاہم یہاں محاضراتِ قرآنی سے متعلق چند قابلِ ذکر نکات کی جانب اشارہ غیر ضروری نہ ہوگا۔

جیسا کہ اکثر قارئین کے علم میں ہے، اس سال محاضرات کے لیے ایک نہایت اہم موضوع 'دعوتِ رجوع الی القرآن کا منظر و پس منظر' تجویز کیا گیا تھا۔ اور چونکہ اس موضوع پر محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی ایک مبسوط تالیف بھی حال ہی میں اشاعت پذیر ہوئی تھی لہٰذا تمام مقالہ نگار حضرات کو دعوت دی گئی تھی کہ وہ اس کتاب ہی کے مندرجات و مشمولات اور اس سے متعلقہ مباحث کو اپنے مقالات کا موضوع بنائیں تاکہ اس اہم موضوع کے مزید گوشے نکھر کر سامنے آئیں اور 'رجوع الی القرآن' کی تحریک کو آگے بڑھانے میں مدد مل سکے۔

اس دفعہ کے محاضرات کی ایک خاص بات یہ تھی کہ ہماری دعوت پر تشریف لانے والے تمام اہلِ علم و دانش حضرات نے محترم ڈاکٹر صاحب کی خواہش کے احترام میں اپنے خیالات مقالات کی شکل میں قلم بند فرمائے تھے۔ چنانچہ کسی قسم کی کوئی تقریر یا کوئی خطاب ان محاضرات کا حصہ نہ بن سکا۔ سوائے ڈاکٹر ظہور احمد صاحب اظہر کی گفتگو کے، کہ اگرچہ انہوں نے محاضرات میں پیش کرنے کے لیے ایک وقیع مقالہ ہمیں ارسال کیا تھا لیکن بوقتِ محاضرات اپنے خیالات زبانی طور پر شرکا تک پہنچانے کو ترجیح دی۔ ایک خاص اہتمام ہماری جانب سے بھی یہ کیا گیا کہ بروقت موصول ہو جانے والے مقالات کو فرداً فرداً محاضرات سے قبل طبع کرا لیا گیا ــــ تاکہ جب فاضل مقالہ نگار محاضرات

کے پلیٹ فارم سے اپنا مقالہ پیش فرمائیں تو وہ پمفلٹ کی شکل میں شرکاء کے ہاتھوں میں بھی ہو۔ اعلیٰ سطح کے سیمینارز میں بالعموم اس روایت کو نبھایا جاتا ہے اور کم از کم خطبۂ صدارت کی نقول شرکاء میں ضرور تقسیم کی جاتی ہیں۔ چھ قابلِ احترام مقالہ نگار حضرات کی جانب سے ہمیں بروقت مقالات موصول ہو گئے تھے چنانچہ ہم نے بہت ہی محدود وقت میں اُنہیں چھاپنے کا اہتمام کیا۔ یہ تجربہ الحمدللہ بہت اچھا رہا۔ اُن مقالات میں شرکاء کا انہماک دیدنی ہوتا تھا جن کی نقول مقالہ پیش کیے جانے کے وقت شرکاءِ مجلس کے ہاتھوں میں بھی ہوتی تھیں۔ جن حضرات کے مقالات محاضرات کے موقع پر ہی طبع کرا لیے گئے تھے، ان کے اسماء گرامی حسب ذیل ہیں:

(۱) مولانا اخلاق حسین قاسمی صاحب (۲) پروفیسر بختیار حسین صدیقی صاحب
(۳) ڈاکٹر محمد یوسف صاحب گورایا (۴) مولانا محمد سعید الرحمان صاحب علوی
(۵) ڈاکٹر ظہور احمد صاحب اظہر (۶) چوہدری مظفر حسین صاحب

محاضرات میں پیش کیے گئے تقریباً تمام ہی مقالات ہمیں موصول ہو چکے ہیں۔ تین مقالات ’حکمتِ قرآن‘ کے اسی شمارے میں شائع کیے جا رہے ہیں، بقیہ مقالات کی اشاعت بھی ان شاءاللہ آئندہ چند ماہ کے شماروں میں مکمل ہو جائے گی۔

اِس سال کے محاضراتِ قرآنی سے متعلق ایک اور قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ سابقہ معمول سے ہٹ کر اِن کا انعقاد ’ٹاؤن ہال‘ کے بجائے ’قرآن آڈیٹوریم‘ کی زیرِ تعمیر عمارت میں کیا گیا۔ قارئین کے علم میں ہے کہ قرآن کالج اور قرآن آڈیٹوریم کی تعمیر کے لیے گارڈن ٹاؤن کے اتاترک بلاک میں مرکزی انجمن نے ایک پانچ کنال کا قطعہ اراضی حاصل کیا تھا۔ گذشتہ چار سالوں سے اس پر تعمیر کا کام جاری تھا۔ وسائل کی کمی کے باعث رفتارِ تعمیر خاصی سُست رہی۔ لیکن اب الحمدللہ قرآن آڈیٹوریم کا STRUCTURE مکمل ہو چکا ہے، گو آڈیٹوریم کے اندرونی حصّے کی لوک پلک سنوارنے کا مرحلہ ابھی باقی ہے۔ آڈیٹوریم میں آٹھ صد سے زائد افراد کے بیٹھنے کی گنجائش ہے۔ چونکہ تنظیم اسلامی کے سالانہ اجتماع کا پروگرام بھی انہی ایام میں ترتیب دیا گیا تھا اور اس میں شرکاء کی متوقع تعداد چھ صد سے متجاوز تھی لہٰذا فیصلہ یہی کیا گیا کہ کچھ فوری اور عارضی انتظامات کے ذریعے آڈیٹوریم کو اس قابل بنا لیا جائے کہ اس میں یہ پروگرام منعقد کیے جا سکیں۔ اس فیصلے کا صائب ہونا بعد میں ثابت بھی ہو گیا، اس لیے کہ موسم کی ناسازگاری کے باوصف محاضرات کی ہر نشست میں قرآن آڈیٹوریم کی تمام نشستیں پُر نظر آتی تھیں۔

ان محاضرات سے متعلق یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ ان میں مرکزی انجمن کے صدر مؤسس محترم ڈاکٹر اسرار احمد نے قریباً بطور سامع ہی کے شرکت کی۔ صرف ایک موقع پر وہ ڈائس پر تشریف لائے۔ مولانا محمد سعید الرحمان صاحب علوی صاحب کے مقالے میں بعض امور ایسے تھے کہ جن کی موقع پر وضاحت محترم ڈاکٹر صاحب نے ضروری خیال کی۔ یہ وضاحت بہت برموقع و برجستہ بھی تھی اور بہت سودمند و مفید بھی! اس موقع پر صاحبِ مقالہ بھی موجود تھے۔ مولانا علوی صاحب کا مقالہ مع محترم ڈاکٹر صاحب کی توضیحات کے، اِن شاء اللہ جلد ہی 'حکمتِ قرآن' میں شائع کر دیا جائے گا۔

∴

الحمدللہ کہ حسبِ سابق جامع القرآن' قرآن اکیڈمی لاہور میں ماہ رمضان کے ساتھ دورۂ ترجمۂ قرآن کا مبارک پروگرام اس سال بھی جاری ہے۔ اس بار یہاں قرآنِ حکیم کے ترجمے اور مختصر تشریح کی ذمہ داری ایک بار پھر محترم ڈاکٹر اسرار صاحب نے اپنے ذمے لی ہے ۔ اور وہ نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے اس قولِ مبارک کے مصداق کہ "اِنَّهٗ لَيَسِيْرٌ عَلٰى مَنْ اَرَادَ اللّٰهُ بِهِ الْخَيْرَ" اِس نازک اور کٹھن ذمہ داری کو کمالِ جذب و شوق کے ساتھ نبھا رہے ہیں۔ یہ مبارک پروگرام نمازِ عشاء کے ساتھ شروع ہوتا ہے تو سحری ہی کی خبر لاتا ہے۔ اللہ کی رحمت سے قوی امید ہے کہ قرآن کی اس بہار سے فائدہ اٹھانے والے طالبین ان شاء اللہ العزیز یومِ قیامت قرآنِ حکیم کی اُس شفاعت کے مستحق ثابت ہوں گے جس کا اشارہ نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے ایک فرمان میں ان الفاظ میں ملتا ہے کہ" اے رب، مَیں نے اس بندے کو رمضان کی راتوں میں سونے سے باز رکھا لہٰذا اس کے حق میں میری شفاعت قبول فرما"۔ نبی اکرمؐ نے بشارت دی ہے کہ قرآن کی یہ شفاعت قبول کی جائے گی۔ اس پروگرام کے مستقل شرکاء کی تعداد کم و بیش تین صد کے قریب ہے۔ اور تجربہ یہ ہے کہ آخری عشرے میں اس تعداد میں کئی چند اضافہ ہو جایا کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ محترم ڈاکٹر صاحب کو استقامت و ہمت عطا فرمائے انہیں اجرِ عظیم سے نوازے اور ہم سب کو زیادہ سے زیادہ رمضان کی برکات کو سمیٹنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

حج کے ذریعے عشق و محبت پیدا کرنے کا حکم

اللہ کی ہدایت نے عشق و محبت پیدا کرنے اور اس کی یاد تازہ رکھنے کے لیے حج کا حکم دیا ہے حج کی ہر ادا (حکم) میں وفاداری، فداکاری، ایثار و قربانی، حق پرستی و جان نثاری اور خود سپردگی کا سبق موجود ہے اور نمونہ کے لیے سیدنا حضرت ابراہیم و حضرت اسمٰعیل علیہما السلام کی زندگیاں ہیں۔

حج ہر حالت میں نہیں ہوتا ہے بلکہ احرام کی حالت میں ہوتا ہے ہر جگہ نہیں ہوتا ہے بلکہ مقدس جگہوں (مکہ اور قرب و جوار) میں ہوتا ہے ہر مہینہ میں نہیں ہوتا ہے بلکہ محترم مہینوں (حج کے مہینہ) میں ہوتا ہے آگے کی آیتوں میں قرآن نے اپنے انداز سے انہی تینوں کا ذکر کیا ہے۔ اور لوگوں میں رائج غلطیوں کی اصلاح بھی کی ہے۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ۭ قُلْ هِىَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ
وَالْحَجِّ ۭ وَلَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا
وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى ۚ وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا ۠ وَاتَّقُوا
اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ
يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ۝
وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَاَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَيْثُ
اَخْرَجُوْكُمْ وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ۚ وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ
الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ فِيْهِ ۚ فَاِنْ قٰتَلُوْكُمْ فَاقْتُلُوْهُمْ ۭ
كَذٰلِكَ جَزَاۗءُ الْكٰفِرِيْنَ ۝ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ
رَّحِيْمٌ ۝ وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ

حج کے ذریعے عشق و محبت پیدا کرنے کا حکم

اللہ کی ہدایت نے عشق و محبت پیدا کرنے اور اس کی یاد تازہ رکھنے کے لیے حج کا حکم دیا ہے حج کی ہر ادا (حکم) میں وفاداری، فداکاری، ایثار و قربانی، حق پرستی و جان نثاری اور خود سپردگی کا سبق موجود ہے اور نمونہ کے لیے سیدنا حضرت ابراہیم و حضرت اسمٰعیل علیہما السلام کی زندگیاں ہیں۔

حج ہر حالت میں نہیں ہوتا ہے بلکہ احرام کی حالت میں ہوتا ہے ہر جگہ نہیں ہوتا ہے بلکہ مقدس جگہوں (مکہ اور قرب و جوار) میں ہوتا ہے ہر مہینہ میں نہیں ہوتا ہے بلکہ محترم مہینوں (حج کے مہینہ) میں ہوتا ہے آگے کی آیتوں میں قرآن نے اپنے انداز سے انہی تینوں کا ذکر کیا ہے۔ اور لوگوں میں رائج غلطیوں کی اصلاح بھی کی ہے۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ۭ قُلْ هِىَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ
وَالْحَجِّ ۭ وَلَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا
وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى ۚ وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا ۠ وَاتَّقُوا
اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ
يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ۝
وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَاَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَيْثُ
اَخْرَجُوْكُمْ وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ۚ وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ
الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ فِيْهِ ۚ فَاِنْ قٰتَلُوْكُمْ فَاقْتُلُوْهُمْ ۭ
كَذٰلِكَ جَزَاۗءُ الْكٰفِرِيْنَ ۝ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ
رَّحِيْمٌ ۝ وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ

الدِّيْنُ لِلّٰهِ ۭ فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَي الظّٰلِمِيْنَ ۝١٩٣
اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ ۭ
فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا
اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ ۠ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ
الْمُتَّقِيْنَ ۝١٩٤ وَاَنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا تُلْقُوْا
بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ۛ وَاَحْسِنُوْا ۚ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۝١٩٥

لوگ آپ سے مہینوں کی چاند رات کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔ آپ کہہ دیجئے کہ ان سے لوگوں کو کام کاج اور حج کا وقت معلوم ہوتا ہے۔ اور نیکی یہ نہیں ہے کہ (احرام کے بعد) گھروں میں انکی پشت کی طرف سے آؤ، بلکہ نیکی اس شخص کی ہے جو برائیوں سے بچے۔ اور تم گھروں میں ان کے دروازوں سے آؤ اور (ہر حال میں) اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تم کامیاب ہوجاؤ لہ اور اللہ کی راہ میں ان سے لڑو جو تم سے لڑیں اور زیادتی نہ کرو، بے شک اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا ہے۔ اور انہیں قتل کرو جہاں پاؤ اور انہیں نکالو جہاں سے انہوں نے تمہیں نکالا ہے، اور فتنہ قتل سے زیادہ سخت ہے۔ اور مسجد حرام کے پاس ان سے نہ لڑو جب تک کہ وہ تم سے نہ لڑیں۔ پھر اگر وہ تم سے لڑیں تو تم بھی انہیں قتل کرو۔ کافروں کی یہی سزا ہے۔ پھر اگر وہ باز آجائیں تو اللہ بڑا بخشنے والا نہایت رحم والا ہے۔ اور ان سے لڑو یہاں تک کہ فتنہ، باقی نہ رہے اور اللہ کا دین قائم ہوجائے۔ پھر اگر وہ باز آجائیں تو سوائے ظالموں کے کسی پر سختی درست نہیں ہے لہ حرمت والے مہینے حرمت والے مہینے کے بدلہ ہیں اور حرمتیں (قابل احترام باتیں اور چیزیں) آپس میں ادلے بدلے کی ہیں۔ پھر جو تم پر زیادتی کرے تم بھی اس پر زیادتی کرو جیسی کہ اس نے تم پر کی ہے۔ اور اللہ سے ڈرو اور جان لو کہ اللہ برائیوں سے بچنے والوں کے ساتھ ہے۔ اور اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ ڈالو اور احسان کرو

بیشک اللہ احسان کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے[۳]

---

[۱] حج کے مہینوں کی چاند رات سے متعلق بہت سے وہم پرستانہ خیالات پھیلے ہوئے تھے جنکے تحت بہت سے رسم و رواج تھے جن کا اسلام سے کوئی جوڑ نہ تھا۔ قرآن نے انکی تفصیل ذکر کئے بغیر سب کو یک قلم ختم کر دیا اور ان سے متعلق جو دو کام اصل تھے جواب میں ان کو برقرار رکھا۔ وہ یہ ہیں (۱) ان کے ذریعہ لوگ اپنے کاروبار، تجارت اور سفر کے اوقات معلوم کرتے ہیں (۲) انکے ذریعہ لوگ حج کے اوقات، مہینہ اور دن معلوم کرتے ہیں۔

احرام کے سلسلہ میں ایک بڑی گمراہی یہ تھی کہ احرام باندھنے کے بعد گھر جانے کی ضرورت ہوتی تو دروازہ سے نہ جاتے تھے، بلکہ گھر کی پشت کی جانب سے، چھت کے اوپر سے یا بڑا سوراخ کر کے جاتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ان دروازوں سے گناہ کر کے آتے جاتے رہے ہیں، اب جب گناہ سے توبہ کی توفیق ہو رہی ہے تو ان دروازوں سے آنا جانا ٹھیک نہیں ہے۔ زیارت گاہوں اور تیرتھ گاہوں میں اس قسم کے توہمات اور بہت سے رسم و رواج کی کبھی کمی نہیں رہی ہے۔ قرآن نے کہا کہ نیکی کی یہ کوئی بات نہیں ہے کہ تم ایسا کرو بلکہ نیکی یہ ہے کہ برائیوں سے بچو اور اللہ سے ڈرتے رہو احرام کے بعد اپنے دروازوں سے داخل ہو۔ بلاوجہ کیوں مشقت میں پڑتے ہو۔

[۲] حج کی مقدس جگہوں کا ظلم و فساد سے پاک ہونا ضروری ہے، اگرچہ اس کے لیے جنگ ہی کرنی پڑے۔ جنگ میں قتل و خونریزی ہوتی ہے جو مقدس جگہوں کے تقدس کے خلاف ہے۔ لیکن وہاں جو ظلم و فساد پھیلا ہوا ہے، لوگوں کی فکر و عمل کی آزادی ختم ہو گئی ہے اس کا دفع کرنا بہرحال ضروری ہے، اگرچہ تقدس کو پامال کرنا پڑے۔ فتنہ و فساد قتل و خونریزی سے کہیں زیادہ برا اور سخت ہے۔ اس کی خاطر قتل و خون ریزی کو برداشت کیا جائے گا، اگرچہ مسجد حرام ہی کے پاس کیوں نہ ہو۔

[۳] حج کے محترم مہینوں کا احترام اپنی جگہ ہے، لیکن اگر کوئی احترام کو ملحوظ نہ رکھے اور ان مہینوں میں ظلم و زیادتی کرے تو اس کا دفعیہ بہرحال ضروری ہے۔ بس اس کا خیال رہے کہ ہر حال میں اللہ سے ڈرتے رہو اور اللہ کی راہ میں خرچ کرتے رہو۔ اپنی طرف سے ظلم و زیادتی نہ ہو اور خرچ نہ کر کے اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔

بیشک اللہ احسان کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے[۳]

[۱] حج کے مہینوں کی چاندرات سے متعلق بہت سے وہم پرستانہ خیالات پھیلے ہوئے تھے جنکے تحت بہت سے رسم و رواج تھے جن کا اسلام سے کوئی جوڑ نہ تھا۔ قرآن نے انکی تفصیل ذکر کئے بغیر سب کو یک قلم ختم کر دیا اور ان سے متعلق جو دو کام اصل تھے جواب میں ان کو برقرار رکھا۔ وہ یہ ہیں (۱) ان کے ذریعہ لوگ اپنے کاروبار، تجارت اور سفر کے اوقات معلوم کرتے ہیں (۲) انکے ذریعہ لوگ حج کے اوقات، مہینہ اور دن معلوم کرتے ہیں۔

احرام کے سلسلہ میں ایک بڑی گمراہی یہ تھی کہ احرام باندھنے کے بعد گھر جانے کی ضرورت ہوتی تو دروازہ سے نہ جاتے تھے، بلکہ گھر کی پشت کی جانب سے، چھت کے اوپر سے یا بڑا سوراخ کر کے جاتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ان دروازوں سے گناہ کر کے آتے جاتے رہے ہیں، اب جب گناہ سے توبہ کی توفیق ہو رہی ہے تو ان دروازوں سے آنا جانا ٹھیک نہیں ہے۔ زیارت گاہوں اور تیرتھ گاہوں میں اس قسم کے توہمات اور بہت سے رسم و رواج کی کبھی کمی نہیں رہی ہے۔ قرآن نے کہا کہ نیکی کی یہ کوئی بات نہیں ہے کہ تم ایسا کرو بلکہ نیکی یہ ہے کہ برائیوں سے بچو اور اللہ سے ڈرتے رہو احرام کے بعد اپنے دروازوں سے داخل ہو۔ بلاوجہ کیوں مشقت میں پڑتے ہو۔

[۲] حج کی مقدس جگہوں کا ظلم و فساد سے پاک ہونا ضروری ہے، اگرچہ اس کے لیے جنگ ہی کرنی پڑے۔ جنگ میں قتل و خونریزی ہوتی ہے۔ جو مقدس جگہوں کے تقدس کے خلاف ہے۔ لیکن جہاں جو ظلم و فساد پھیلا ہوا ہے، لوگوں کی فکر و عمل کی آزادی ختم ہو گئی ہے اس کا دفع کرنا بہرحال ضروری ہے، اگرچہ تقدس کو پامال کرنا پڑے۔ فتنہ و فساد قتل و خونریزی سے کہیں زیادہ برا اور سخت ہے۔ اس کی خاطر قتل و خون ریزی کو برداشت کیا جائے گا، اگرچہ مسجد حرام ہی کے پاس کیوں نہ ہو۔

[۳] حج کے محترم مہینوں کا احترام اپنی جگہ ہے، لیکن اگر کوئی احترام کو ملحوظ نہ رکھے اور ان مہینوں میں ظلم و زیادتی کرے تو اس کا دفعیہ بہرحال ضروری ہے۔ بس اس کا خیال رہے کہ ہر حال میں اللہ سے ڈرتے رہو اور اللہ کی راہ میں خرچ کرتے رہو۔ اپنی طرف سے ظلم و زیادتی نہ ہو اور خرچ نہ کر کے اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔

محدثین کرام کی علمی خدمات

صحیح ابن خزیمہ..... امام ابن خزیمہ کی مشہور تصنیف ہے۔ اس کا شمار حدیث کی اہم اور معتبر کتابوں میں ہوتا ہے۔ مستند مصنفین اور ثقہ علمائے کرام نے اس کی حدیثوں سے اخذ و استنباط کیا ہے۔ حافظ ابن کثیر (م ۷۷۴ھ) لکھتے ہیں:

"من انفع الکتب و اجلها" ۱؎

یعنی صحیح ابن خزیمہ نہایت مفید اور اہم کتابوں میں سے ہے۔

علامہ سیوطی (م ۹۱۱ھ) لکھتے ہیں:

"صحیح ابن خزیمہ کا پایہ صحیح ابن حبان سے زیادہ ہے، کیونکہ ابن خزیمہ نے صحت کی جانب زیادہ توجہ کی ہے۔ وہ ادنیٰ شبہ پر بھی توقف سے کام لیتے ہیں" ۲؎

حافظ ابن حجر عسقلانی (م ۸۵۲ھ) نے صحیح ابن خزیمہ پر مفید علمی حواشی لکھے۔ ۳؎

امام ابو عوانہ اسفرائنی (م ۳۱۶ھ)

امام ابو عوانہ کا نام یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم تھا۔ قریہ اسفرائن من مضافات نیشاپور کے رہنے والے تھے۔ سن ولادت کے بارے میں ارباب سیر خاموش ہیں۔ تاہم آپ کی وفات ۳۱۶ھ میں ہوئی۔ ۴؎ ابتدائی تعلیم اسفرائن میں حاصل کی۔ بعدازاں تحصیل حدیث کے لئے خراسان، عراق، یمن، حجاز، شام، جزیرہ، فارس، اصفہان اور مصر کا سفر کیا اور نامور محدثین کرام سے استفادہ کیا۔ ۵؎ آپ کے اساتذہ میں امام مسلم (م ۲۶۱ھ)، امام ابو حاتم رازی (م ۲۷۷ھ) اور امام ابو زرعہ (م ۲۶۴ھ) جیسے نامور محدثین کرام شامل ہیں۔

امام ابو عوانہ کے فضل وکمال ، ثقاہت و عدالت ، حفظ و ضبط اور تبحر علمی کا اعتراف ارباب سیرو تذکرہ نویسوں نے کیا ہے اور ان کو ممتاز علمائے اسلام میں شمار کیا ہے۔ ۶۔
فقہی مسلک میں امام محمد بن ادریس شافعی (م ۲۰۴ھ) کے مذہب سے وابستہ تھے اور ان کی بدولت اسفرائن میں مذہب شافعی کی ترویج و اشاعت ہوئی۔ ۷۔

مسند ابو عوانہ ـــ امام ابو عوانہ کی مشہور تصنیف ہے۔ یہ دراصل صحیح مسلم پر مستخرج ہے۔ مستخرج محدثین کی اصطلاح میں اس کتاب کو کہتے ہیں جس میں کسی دوسری کتاب کی حدیثوں کو اس کی ترتیب ، متون ، اور طرق اسناد کے مطابق نقل کیا جاتا ہے۔ مسند ابو عوانہ میں امام مسلم کے طرق و اسناد کے علاوہ دوسرے طرق و اسناد اور بعض متون کا اضافہ بھی کیا گیا ہے اس لئے اس کو صحیح بھی کہا جاتا ہے اور اس حیثیت سے مسند ابو عوانہ ایک مستقل تصنیف بن گئی ہے۔
علامہ ذہبی (م ۷۴۸ھ) لکھتے ہیں۔

> صاحب الصحیح المسند المخرج علی صحیح مسلم و له فیه زیادات عدة ۸۔
>
> " ابو عوانہ صاحب صحیح مسند ہیں۔ ان کی کتاب صحیح مسلم پر تخریج کی گئی ہے لیکن اس میں متعدد اضافے بھی ہیں "

مسند ابو عوانہ کے ساتھ علمائے فن نے اعتنا کیا ہے۔ حافظ ذہبی (م ۷۴۸ھ) نے المنتقی کے نام سے اس کی ۲۳۰ احادیث کو منتخب کیا ہے۔ ۹۔

مسند ابو عوانہ پہلی مرتبہ مولانا محمد ہاشم ندوی نے ایڈٹ کرکے دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدر آباد دکن سے ۱۳۶۲ھ اور ۱۳۶۳ھ میں دو جلدوں میں شائع کی اور اس پر مفید حواشی اور تعلیقات لکھے۔ دونوں جلدوں کے آخر میں ابواب و فصول کی مکمل فہرست ، اسماء و اعلام کا انڈکس اور پہلی جلد میں مصنف اور تصنیف کے متعلق مفید معلومات درج کی ہیں۔ ۱۰۔

امام ابن حبان (م ۳۵۴ھ)

امام ابن حبان کا نام محمد بن حبان تھا۔ ۲۷۵ھ میں پیدا ہوئے۔ ۱۱۔ اور ۳۵۴ھ میں ۸۰ سال کی عمر میں ان کا انتقال ہوا۔ ۱۲۔ امام صاحب کے اساتذہ و شیوخ کی تعداد بہت

زیادہ ہے۔ امام ابن خزیمہ (م ۳۱۱ھ)، امام نسائی (م ۳۰۳ھ) اور ابو یعلی موصلی (م ۳۰۷ھ) کا نام ان کے اساتذہ کی فہرست میں شامل ہے۔ امام ابن خزیمہؒ سے آپ کا تعلق غیر معمولی تھا۔ سفر، حضر میں ان کے ساتھ رہتے تھے۔ فقہ، حدیث، اصول اور فرائض کی تعلیم آپ نے ان ہی سے حاصل کی۔ ۱۳؎

تحصیل حدیث کے لئے ابن حبان نے کئی شہروں کا سفر کیا۔ علامہ تقی الدین سبکی (م ۷۷۱ھ) لکھتے ہیں:

"ابن حبان نے علم وفن کی تحصیل کے لئے اسکندریہ (مصر) مرو، نیشاپور، ہواز، ایلہ، بصرہ، واسط، بغداد، کوفہ، مکہ، موصل، حلب، انطاکیہ، حمص، بخارا، ماوراء النہر، عراق، حجاز، شام، اور جزیرہ کا سفر کیا اور ہر جگہ اساتذہ فن سے استفادہ کیا۔" ۱۴؎

ابن حبان کی ثقاہت وعدالت، فضل وکمال اور حفظ وضبط کا ائمہ فن نے اعتراف کیا ہے۔ علم حدیث کے علاوہ دوسرے علوم اسلامی پر بھی ان کی نظر گہری تھی۔ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (م ۱۲۳۹ھ) لکھتے ہیں:

"سوائے علم حدیث علوم دیگر ہم داشت، فقہ ولغت، طب ونجوم، فلک وہندسہ، رانیک می دانست۔" ۳؎

"وہ علم حدیث کے علاوہ دوسرے علوم اسلامی میں بھی درک رکھتے تھے۔ فقہ ولغت، طب ونجوم، فلک وہندسہ سے خوب واقف تھے۔"

فقہی مسلک میں اپنے شیخ ابن خزیمہ کی طرح تقلید کی بجائے تفقہ و اجتہاد سے کام لیتے تھے اور ان کا شمار مجتہدین میں ہوتا ہے۔ ۱۵؎

امام ابن حبان صاحب تصانیف کثیرہ تھے۔ ان کی تصنیفات، کیفیت وکمیت دونوں کے اعتبار سے اہم اور علمائے فن وتحقیق کا ماخذ ومرجع ہیں۔

علامہ ابن حجر عسقلانی (م ۸۵۲ھ) لکھتے ہیں کہ:

"ابن حبان نے ہر فن میں مفید کتابیں لکھی تھیں۔ علمائے اسلام میں ایسے جامع

کمالات لوگ کم گزرے ہیں، جن کو اتنے گوناگوں اور متنوع علوم میں اس قدر رسوخ اور ایسی مکمل مہارت حاصل رہی ہو۔ ان میں کمالات اور جامعیت کی وجہ سے مورخین نے انہیں امام عصر، فاضل، متقن، العالم البحر اور العلامۃ المتبحر لکھا ہے۔" ۱۶۔

'صحیح ابن حبان' آپ کی مشہور و معروف کتاب ہے۔ اس کا نام التقاسیم والانواع بھی ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (م۱۱۷۶ھ) نے اس کو طبقات حدیث کے تیسرے طبقہ میں شمار کیا ہے۔ ۱۷۔

علامہ عبدالحی بن العماد الحنبلی (م۱۰۸۹ھ) لکھتے ہیں۔

"(۱) ...... صحیح ابن حبان کی سب سے زیادہ اہم خصوصیت اس کی صحت ہے۔ صحیح میں جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں ابن خزیمہ کی کتاب کے بعد اسی کا درجہ ہے۔ بعض محدثین نے اس کو سنن ابن ماجہ سے زیادہ روایتوں کا مجموعہ بتایا ہے اور بعض کا خیال ہے کہ صحیحین کے بعد بہتر اور عمدہ مجموعے ابن خزیمہ اور ابن حبان کے ہیں۔

(۲) ...... صحیح ابن حبان کو مروجہ طریقوں پر مرتب نہیں کیا گیا بلکہ اقسام و انواع پر مرتب کیا گیا ہے۔

(۳) ...... ہر حدیث کے آخر میں رجال و اسناد کی تحقیق، حدیث کے مفہوم کی تعیین و وضاحت اور اسنادی متون کی فنی بحثیں اور دوسرے مفید امور بیان کئے گئے ہیں۔" ۱۸۔

حال ہی میں مولانا عبدالشکور اثری، ناظم المکتبۃ الاثریہ، اردو بازار لاہور نے اس کو ۷ جلدوں میں بہترین کاغذ اور طباعت میں شائع کیا ہے۔

امام طبرانی (م ۳۶۰ھ)

امام طبرانی کا نام سلیمان بن احمد اور کنیت ابوالقاسم تھی۔ ۲۶۰ھ میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۔ اور ۳۶۰ھ میں سو سال کی عمر میں آپ نے وفات پائی۔ ۲۰۔ امام طبرانی کے اساتذہ و شیوخ کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ امام ابو عبدالرحمان احمد بن شعیب نسائی (م۳۰۳ھ) بھی آپ کے اساتذہ میں سے ہیں۔

۱۵ سال کی عمر میں تحصیل علم کے لئے نکلے اور حمص ' جبلہ ' مدائن ' شام ' مکہ معظمہ ' مدینہ منورہ ' یمن ' مصر ' بغداد ' کوفہ ' بصرہ ' جزیرہ ' فارس ' اصفہان گئے۔ اور ہر جگہ اہل فن سے استفادہ کیا۔ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (م ۱۲۳۹ھ) لکھتے ہیں :

"۳۰ سال تک ان کو بستر پر سونا نصیب نہیں ہوا۔ مگر وہ آرام و آسائش کا خیال کئے بغیر حدیث کی تحصیل میں مشغول اور بوریا پر سوتے رہے" ۲۱۔

امام طبرانی کے حفظ و ضبط ' عدالت و ثقاہت ' علم و فضل و اور تبحّرِ علمی کا اربابِ سیر اور علمائے فن نے اعتراف کیا ہے۔ ذہبی (م ۷۴۸ھ) لکھتے ہیں کہ "طبرانی بڑے عظیم رتبہ کے محدث تھے۔ ۲۲۔ ' دین کے معاملہ میں بہت سخت تھے۔ ان کو صحابہ کرامؓ سے غیر معمولی محبت و عقیدت تھی" ۲۳۔

امام صاحب کی تصانیف کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ مگر ان میں معجم کبیر ' معجم اوسط اور معجم صغیر بہت زیادہ مشہور ہیں۔ محدثین کی اصطلاح میں معجم ان کتابوں کو کہتے ہیں ' جن میں شیوخ کی ترتیب سے احادیث درج کی جاتی ہیں اور بعض کتابوں میں شیوخ کی وفات اور ان کے علم و تقویٰ کو بھی ملحوظ رکھا جاتا ہے لیکن عموماً حروف تہجی کے لحاظ سے معاجم ترتیب دیئے جاتے ہیں۔ صحابہ کرامؓ اور بلاد و امصار کی ترتیب پر بھی معاجم مرتب کئے گئے ہیں۔

امام طبرانی نے تین معاجم ترتیب دیئے ' جس کی وجہ سے ان کی بہت شہرت ہوئی۔ معجم کبیر میں آپ نے مشہور صحابی حضرت ابو ہریرہؓ (م ۵۹ھ) جن کا شمار کثیر الروایات صحابہ میں ہوتا ہے۔ ۲۴ ان کی روایات جمع نہیں کیں۔ امام صاحب ان کی روایات علیحدہ مرتب کرنا چاہتے تھے لیکن مرتب نہ کر سکے۔ معجم اوسط کو شیوخ کے ناموں پر مرتب کیا گیا ہے۔ اس میں امام صاحب نے اپنے ایک ہزار شیوخ کے افراد و غرائب جمع کئے ہیں۔ معجم صغیر کی ترتیب بھی شیوخ کے ناموں پر ہے اور ایک ہزار سے زیادہ شیوخ کی ایک ایک حدیث اس میں درج کی ہے اور کتاب کے آخر میں بعض خواتین کی حدیثیں درج کی ہیں جن کی تعداد ۲ ہزار کے قریب ہے۔ معجم صغیر ۱۳۱۱ھ میں مطبع انصاری دہلی سے شائع ہوئی۔ ۲۵۔

(باقی صـ۶۳ پر)

لغات واعرابِ قرآن

(۱۱)

پروفیسر حافظ احمد یار

سورۃ البقرہ (۶)

ملاحظہ: کتاب میں حوالہ کے لیے قطعہ بندی (پیراگرافنگ) میں بنیادی طور پر تین ارقام (نمبر) اختیار کیے گئے ہیں۔ سب سے پہلا (دائیں طرف والا) ہندسہ سورۃ کا نمبر شمار ظاہر کرتا ہے۔ اس سے اگلا (درمیانی) ہندسہ اس سورت کا قطعہ نمبر (جو زیرِ مطالعہ ہے اور جو کم از کم ایک آیت پر مشتمل ہوتا ہے) ظاہر کرتا ہے۔ اس کے بعد والا (تیسرا) ہندسہ کتاب کے مباحثِ اربعہ (اللغۃ، الاعراب، الرسم اور الضبط) میں سے زیرِ مطالعہ مبحث کو ظاہر کرتا ہے۔ یعنی علی الترتیب اللغۃ کے لیے ۱، الاعراب کے لیے ۲، الرسم کے لیے ۳ اور الضبط کے لیے ۴ کا ہندسہ لکھا گیا ہے۔ بحث اللغۃ میں چونکہ متعدد کلمات زیرِ بحث آتے ہیں اس لیے یہاں حوالہ کی مزید آسانی کے لیے نمبر ۱ کے بعد قوسین (بریکٹ) میں متعلقہ کلمہ کا ترتیبی نمبر بھی دیا جاتا ہے۔ مثلاً ۲ : ۵ : ۱ (۳) کا مطلب ہے سورۃ البقرہ کے پانچویں قطعہ میں بحث اللغۃ کا تیسرا لفظ اور ۲ : ۵ : ۳ کا مطلب ہے سورۃ البقرہ کے پانچویں قطعہ میں بحث الرسم ــــ وھکذا۔

۶:۲ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ۭ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ۠ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝

۲ : ۶ : ۱ اللغۃ

۲ : ۶ : ۱ (۱) [خَتَمَ] کا مادہ "خ ت م" اور وزن "فَعَلَ" ہے۔ یعنی یہ ثلاثی مجرد کے فعل ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب (پہلا صیغہ) ہے۔ اس مادہ (ختم) سے فعل ثلاثی مجرد باب ضرب سے اور ہمیشہ متعدّی آتا ہے۔ اکثر صلہ "علیٰ" کے ساتھ

اور کبھی بغیر صلہ کے (مفعول بنفسہ کے ساتھ) آتا ہے ۔مگر دونوں صورتوں میں ۔
ایک ہی باب (ضرب) سے ہوتے ہوئے بھی ــــ معنی الگ الگ ہوتے ہیں اور
عربی میں یہ فرق مصدر کے فرق سے ظاہر ہوتا ہے اس کی تفصیل یوں ہے:-

" علیٰ " کے صلہ کے ساتھ یہ فعل ختم علی ..... یختِمِ خِتامًا کی شکل میں
آتا ہے اور اس کے معنی " ...... پر مہر لگا دینا ، ...... کو سربمہر کر دینا " [تاکہ اب (اس)
میں نہ کچھ داخل ہو سکے اور نہ کچھ اس سے نکل سکے] ۔ قرآن کریم میں اس فعل سے ــــ
اور ان معنی کے لیے ــــ صیغۂ ماضی (خَتَمَ) تین جگہ [البقرہ : ۷ ، الانعام : ۴۶
اور الجاثیہ : ۲۳] اور صیغۂ مضارع (یختِم) ایک جگہ (الشوریٰ : ۲۴) اور "نختِمُ"
(جمع متکلم) بھی ایک جگہ (یٰسٓ : ۶۵) آیا ہے ۔ اور ہر جگہ ان صیغوں کے ساتھ صلہ
" علیٰ " ہی آیا ہے ــــ ان (مذکورہ بالا) معنی کے لیے اس فعل کا مصدر عمومًا "خِتام"
ہوتا ہے جو قرآن کریم میں بھی ایک جگہ (المطففین : ۲۶) وارد ہوا ہے ۔ اردو محاورے
اور علی کے صلہ کو مدِنظر رکھتے ہوئے مترجمین نے یہاں " ختم " ...... " کا ترجمہ
" مہر کی " ، " مہر کر دی " ، "بند لگا دیا " ، " مہر لگا دی " ، " مہر لگا رکھی ہے "
سے کیا ہے ۔

صلہ کے بغیر یہ فعل ثلاثی مجرد (اسی باب ضرب سے) خَتَمَ .... یختِمُ ختمًا
آتا ہے اور اس کے معنی " .... (کسی کام) ..... کو پورا کر لینا " ہوتے ہیں مثلاً
خَتَمَ الکتابَ : اس نے پوری کتاب پڑھ لی یا خَتَمَ العملَ : اس نے کام
مکمل کر لیا ۔ اس صورت میں اس فعل کا مصدر عمومًا " خَتْم " آتا ہے [اور اسی
سے " خَتْمِ القرآن " استعمال ہوتا ہے] تاہم ان معنوں میں ــــ یا صلہ کے
بغیر ــــ یہ فعل قرآن کریم میں کہیں استعمال نہیں ہوا ۔ عربی زبان میں تو اس مادہ (ختم)
سے مزید فیہ کے بعض ابواب سے بھی افعال مختلف معنوں کے لیے استعمال ہوتے
ہیں ــــ بلکہ لفظ " اختتام " ــــ جو باب افتعال کا مصدر ہے ۔ اردو میں بھی مستعمل
ہے ــــ تاہم قرآن کریم میں اس مادہ سے مزید فیہ کا بھی کوئی فعل نہیں آیا ہے ۔
[اللہ] کے امکانی مادہ اور اشتقاق وغیرہ پر " بسم اللہ " کی بحث

میں بات ہو چکی ہے ۔ دیکھئے ۱:۱:۱ (۲)

۲:۶:۱ (۲) [عَلٰی قُلُوْبِهِمْ] جو علی (پر) + قلوب (دلوں) + هُم (ان کے) کا مرکب ہے ۔ ان (تین) کلمات میں سے : [علی] تو یہاں گذشتہ فعل "ختم" کے صلہ کے طور پر آیا ہے اور "خَتَمَ عَلٰی" کے معنی اور مصدر پر بات ابھی اوپر گزری ہے ـــــ تاہم بطور حرف الجرّ کے بھی اس (عَلٰی) کے متعدد معنی اور استعمالات ہیں ۔ اہم اور زیادہ مستعمل مواقع کا اردو ترجمہ حسبِ موقع (۱) ..... پر (۲) ..... کے اوپر (۳) ..... کے باوجود (۴) ..... کے ہوتے ہوئے (۵) ..... کے موقع پر (۶) ..... کے خلاف (۷) ..... کی بنا پر ۔ وغیرہ سے کیا جا سکتا ہے ۔ اور یہ (علی) کبھی کسی دوسرے حرف الجرّ مثلاً مِنْ (سے) ، بِ (کے ساتھ) اور فی (میں) کے معنی میں بھی آتا ہے ـــــ اور یہی (علیٰ) مختلف افعال کے ساتھ بطور صلہ استعمال ہو کر ان میں متعدد معانی پیدا کرتا ہے ۔ یہ بات پہلے بھی (۱:۶:۱ (۳)) بیان ہو چکی ہے کہ ضمائر کے ساتھ استعمال ہوتے وقت اس کا ملفوظی الف مقصورہ "یاء" میں بدل جاتا ہے یعنی اسے عَلٰی ("علا") کی بجائے "عَلَیْ" پڑھا جاتا ہے اور [قلوب] کا مادہ "ق ل ب" اور وزن "فُعُوْلٌ" ہے ۔ یہ لفظ جمع مکسر ہے اس کا واحد "قَلْبٌ" ہے جس کا اردو ترجمہ "دل" ہے ۔

اس مادہ سے فعل ثلاثی مجرد قَلَبَ .... یَقْلِبُ قَلْبًا (عموماً باب ضرب سے) آتا ہے اور اس کے بنیادی معنی "..... کو اُلٹ دینا / پلٹ دینا" ہوتے ہیں ۔ یہ فعل حسی نیز معنوی "اُلٹ پلٹ" کے لیے استعمال ہوتا ہے ۔ مثلاً "قَلَبَ الرداءَ" (چادر کو الٹ دینا ۔ اوپر کا حصہ نیچے یا اندر کا حصہ باہر کر دینا) ، "قَلَبَ الامرَ" (معاملے کی خوب جانچ پڑتال کرنا) ۔ قرآن کریم میں اس کا فعل ثلاثی مجرد تو بصیغۂ مضارع مجہول صرف ایک جگہ (العنکبوت : ۲۱) آیا ہے (اور اس میں بھی بابِ افعال سے ہونے کا احتمال موجود ہے) ۔ البتہ مزید فیہ کے ابواب تفعیل ، تفعّل اور انفعال سے افعال کے کچھ صیغے اور بعض مصادر اور اسماء مشتقہ تیس ۳۰ سے زائد مقامات پر وارد ہوئے ہیں ۔ ان سب پر اپنی اپنی جگہ بات ہوگی ۔ انشاء اللہ ۔

کلمۂ " قلب " (جس کی جمع " قلوب " اس وقت زیرِ مطالعہ ہے) اسی مادہ سے ثلاثی مجرد کا مصدر بھی ہے اور ایک اسم بھی۔ اس کا عام اردو ترجمہ " دل " ہی کیا جاتا ہے۔ یعنی انسانی جسم کا صنوبری شکل کا وہ اندرونی عضو جو بدن میں دورانِ خون کا ذمہ دار ہے۔ یہ لفظ (قلب) بصیغۂ واحد (مفرد یا مرکب) کل ۱۴ جگہ اور اس کی جمع (قلوب) مفرد یا مرکب صورت میں کل ۱۱۲ جگہ (قرآن کریم میں) آئی ہے۔ تاہم قرآن کریم میں " قلب " کے اعمال و افعال اور صفات و کیفیات جس طرح بیان ہوئی ہیں، ان کا تعلق علم افعال الاعضا (PHYSIOLOGY) سے نہیں بلکہ نفسیات اور روحانیات سے ہے۔ اس لیے مجازاً " قلب " کو حسبِ موقع باطن، ذہنی کیفیت، عقل، ضمیر، روح، نفس، قوتِ ادراک وغیرہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور قلب کو انسان کی باطنی، روحانی، ذہنی اور نفسیاتی کیفیات و جذبات اور ارادہ و احساسات کا مرکز قرار دیا گیا ہے۔ ان میں سے ایک کیفیت " دل پر مہر لگ جانا ہے " جو یہاں مذکور ہوئی ہے۔ قرآن کریم کی سوا سو سے زائد[۱۲۵] " آیات القلب " اہلِ تفسیر کا عموماً اور اہلِ تصوّف کا خصوصاً موضوعِ بحث ہیں۔ بلکہ شاید بعض جدید علوم مثلاً نفسیات اور تحلیلِ نفسی کے ماہرین کے لیے بھی قابلِ توجہ ہو سکتی ہیں۔ تاہم اس قسم کی بحث میں جانا ہمارے موضوع اور دائرہ کار سے خارج ہے۔

" علی قلوبھم " کا ترجمہ بیشتر مترجمین نے لفظ " قلوب " کی جمع کی رعایت سے " ان کے دلوں پر " کیا ہے۔ تاہم بعض نے صرف واحد کے ساتھ " ان کے دل پر " سے بھی ترجمہ کیا ہے جو شاید اردو محاورے کے اعتبار سے درست ہو مگر الفاظِ عبارت کے لحاظ سے محلِ نظر ہے۔

۲:۶:۱ (۳) [وَعَلٰى سَمْعِهِمْ] جو وَ + عَلٰى + سَمْع + هم ہے اس میں " وَ " تو عاطفہ بمعنی " اور " ہے۔ " علی " گزشتہ فعل " ختم " کا صلہ ہے اور اس (علی) کی تکرار تاکید اور زور کے لیے ہے جسے اردو میں " بھی " (یعنی " پر بھی ") سے ظاہر کیا جا سکتا ہے۔ آخری " ھم " ضمیر مجرور بمعنی " ان کا "

ہے اور [سَمْعٌ] کا مادہ " س م ع " اور وزن " فَعْلٌ " ہے ۔ اس مادہ سے فعل ثلاثی مجرد " سمِع ..... یسمَع سَمْعًا " (باب سمِع سے بلکہ اسی فعل سے باب کا نام اخذ کیا گیا ہے) آتا ہے ۔ اس کے معنی " .....کو سننا " یا صرف " سننا یا سن لینا " ہوتے ہیں ۔ یہ فعل ہمیشہ متعدّی ہوتا ہے اگرچہ اکثر اس کا مفعول محذوف (اور غیر مذکور) ہوتا ہے ۔

● " سَمْعٌ " دراصل تو مصدر ہے بمعنی " سننا " ۔ پھر یہ " سماعت " (جو خود بھی مصدر ہے اور اردو میں مستعمل ہے) یا قوتِ سامعہ (سننے کی حس) اور بعض دفعہ خود " کان " (عضو سماعت) کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے ۔ تاہم چونکہ یہ لفظ (سمع) مصدر ہے اور مصدر میں قلت یا کثرت (بلحاظ عدد) دونوں کا احتمال ہوتا ہے اس لیے یہ واحد اور جمع دونوں معنوں کے لیے استعمال ہو سکتا ہے ۔ جیسے یہاں (آیت زیر مطالعہ میں) آیا ہے ۔ ویسے اس کی جمع مکسر " اسماع " وغیرہ آتی ہے ۔ تاہم قرآن کریم میں یہ لفظ بائیس (۲۲) جگہ آیا ہے اور ہر جگہ بصیغۂ واحد مگر (عموماً) بمعنیٔ جمع ہی استعمال ہوا ہے ۔ اور زیادہ تر (۱۲ جگہ) معرف باللام (السَّمْع) اور آٹھ جگہ مضاف ہو کر آیا ہے ۔ جس کی بنا پر یہ مصدری معنی (سننا) کی بجائے قوت سامعہ یا عضو سماعت (کان) کے معنی دیتا ہے ۔ اور شاید اسی بناء پر بیشتر مترجمین نے " علی سمعھم " کا ترجمہ " ان کے کانوں پر " کیا ہے بعض نے صرف واحد کے ساتھ " ان کے کان پر " کیا ہے یعنی لفظ کی رعایت سے ۔ اور جن مترجمین نے اس (سمعھم) کا ترجمہ " ان کی شنوائی " کیا ہے وہ مصدر کا ترجمہ حاصل مصدر کے ساتھ ہونے کے لحاظ سے زیادہ بہتر ہے ۔

اس مادہ (سمع) سے بکثرت اسماء اور مختلف ابواب سے بہت سے افعال قرآن کریم میں وارد ہوئے ہیں ۔ ہر ایک کا بیان اپنی اپنی جگہ ہوگا ۔ انشاء اللہ ۔

۲ : ۶ : ۱ (۴) [وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ] جو دراصل وَ + علی + ابصار + ھم کا مرکّب ہے ۔ اس میں وَ (اور) ، علی (پر) اور ھم (ان کی) کے معنی تو

اب آپ کو معلوم ہی ہو چکے ہیں (ابھی اوپر بھی اس کا ذکر ہوا ہے) البتہ توجہ طلب لفظ "البصار" ہے (اس لفظ کی عام عربی املاء یہی (البصار) ہے۔ اس کے رسم قرآنی یا عثمانی پر بات ابھی آگے بحث "الرسم" میں آئے گی)

● [البصار] کا مادہ "ب ص ر" اور وزن "اَفعال" ہے۔ یہ جمع مکسر ہے اور اس کا واحد "بَصَرٌ" بروزن "فَعَلٌ" ہے۔ اس مادہ (بصر) سے فعل ثلاثی مجرد "بصُر یَبصُر بَصَرًا (باب کرم سے) اور بَصِر یبصَر بصَرًا (باب سمع سے) آتا ہے اور اس کے بنیادی معنی "دیکھنا" ہیں ـــ یہ فعل "باء (بِ)" کے صلہ کے ساتھ بھی آتا ہے اور بغیر صلہ کے بھی ـــ اور دونوں صورتوں میں متعدی ہوتا ہے یعنی "بصُر بہ" و "بصِر بہ" اور "بصُرہٗ" اور "بَصِرہٗ" کے معنی "..... کو دیکھ لینا"، ..... کو جان لینا"، ..... کو سمجھ جانا" ہوتے ہیں[1] اس فعل میں محض آنکھ سے "دیکھ لینا" سے بڑھ کر دماغ سے "جان لینا" کا مفہوم بھی شامل ہوتا ہے۔ نیز صلہ ("بِ") کے ساتھ استعمال زیادہ فصیح شمار ہوتا ہے۔ اور قرآن کریم میں یہ فعل ہر جگہ باء (بِ) کے صلہ کے ساتھ اور وہ بھی صرف "باب کرُم" سے ہی آیا ہے۔ عربی میں یہ فعل "باب نصر" سے بھی مختلف معنوں کے لیے استعمال ہوتا ہے تاہم قرآن کریم میں یہ باب (نصر) اور اس کے معنی کہیں استعمال نہیں ہوئے۔

● "بصَرٌ" (جو "البصار" کا واحد ہے) دراصل تو اسی فعل ثلاثی مجرد (باب کرم یا سمع سے) کا مصدر بمعنیٔ "دیکھنا" ہے۔ پھر یہ بصارت بمعنی "نظر"، "نگاہ"، "بینائی" یا قوتِ باصرہ (دیکھنے کی حس) اور بعض دفعہ خود آنکھ (عضوِ بصارت) کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے [خیال رہے لفظ "بصارت" جو عربی میں "بصارۃ" لکھا جاتا ہے۔ یہ خود بھی مذکورہ بالا دونوں ابواب سے ثلاثی مجرّد کا مصدر ہے]۔ اور پھر ان ہی (حِسّ یا آنکھ) کے معنی کے لحاظ سے اس کی جمع "ابصار" آتی

---

[1] دیکھئے مدالقاموس تحت مادہ "بصر"

ہے اور اسی لیے بیشتر مترجمین نے " علی ابصارھم " کا ترجمہ ۔۔۔۔ ان کی آنکھوں پر کیا ہے ۔ ورنہ مصدر میں تو قلت اور کثرت دونوں کا احتمال ہوتا ہے اور اسی لیے واحد (بصرٌ) بمعنیٔ جمع (ابصار) بھی استعمال ہو سکتا ہے ۔ تاہم لفظ " سَمْعٌ " کے برعکس (جو قرآن کریم میں ہر جگہ بصورت واحد (سمعٌ) ہی استعمال ہوا ہے) یہ لفظ (بصرٌ) زیادہ تر بصورت جمع (ابصار) ہی استعمال ہوا ہے ـــ معرف باللام ہو کر (الابصار) بھی اور مضاف ہو کر بھی (جیسے یہاں آیت زیر مطالعہ میں ہے) ۔

● قرآن کریم میں لفظ " سمع " (جیسا کہ اوپر بیان ہوا ہے) مختلف شکلوں (مفرد مرکب معرفہ نکرہ) میں بائیس (۲۲) جگہ آیا ہے اور ہر جگہ اسی طرح (بصیغۂ واحد) ہی آیا ہے البتہ لفظ " اذن " (کان) واحد تثنیہ جمع ہر طرح استعمال ہوا ہے ۔ اس پر بات اپنی جگہ ہو گی ۔ اس کے مقابلے پر لفظ " بصر " (بصیغۂ واحد) زیادہ تر (۸ جگہ) معرف باللام (البصر) اور دو جگہ مضاف ہو کر آیا ہے ۔ اور بصیغہ جمع (ابصار) یہ لفظ معرفہ نکرہ مفرد مرکب شکلوں میں چالیس[؟] کے قریب مقامات پر وارد ہوا ہے ۔ واحد جمع کے اس فرق کے علاوہ جہاں بھی یہ دونوں لفظ (سمع اور ابصار) ساتھ ساتھ آئے ہیں وہاں " سمع " پہلے اور " ابصار " بعد میں آیا ہے ۔ بعض اہل علم نے اس فرق کی توجیہ کی کوشش بھی کی ہے[۱] یہ اہل تفسیر کا میدان ہے ہم تو اہل عرب کے استعمال اور ان کے ذوقِ فصاحت کو ہی اس کی وجہ سمجھتے ہیں ـــــــ اس مادہ (بصر) سے بکثرت اسماء و افعال (۱۵۰ کے قریب مقامات پر) آتے ہیں ۔ جن پر اپنے اپنے موقع پر بات ہو گی ۔ ان شاء اللہ ۔

۲ : ۶ : ۱ (۵) [**غِشَاوَۃٌ**] کا مادہ " غ ش و " اور وزن " فِعَالَۃٌ " ہے ۔ اس لفظ کی بھی عام عربی املاء ـــ رسم معتاد کے مطابق ـــ یہی (غشادۃ)

---

[۱] روح المعانی ج ۱ ص ۱۳۶ پر بھی اس توجیہ کا مختصراً ذکر ہے ۔ تاہم جو حضرات تفصیل چاہتے ہوں ان کے لیے علی ناصف النجدی کی کتاب " مع القرآن الکریم " (طبع دارالمعارف) میں شامل بحث بعنوان " السمع و المبصر فی القرآن الکریم " (ص ۶۱ تا ۷۰) کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا ۔

ہے۔ اس کے رسمِ قرآنی یا رسمِ عثمانی پر بات ابھی آگے " الرسم " میں ہوگی۔ اس مادہ (غ ش د) سے فعل ثلاثی مجرد زیادہ تر باب سمِع سے، متعدّی اور بغیر صلہ کے آتا ہے " غشِی ..... یَغشٰی (دراصل غشِو یغشَوُ) غشاوۃً "— اور اس کے معنی ہیں: "..... کو ڈھانپ لینا، چھپا لینا یا ..... پر چھا جانا " — یہ فعل یائی اللام مادہ (غ ش ی) سے بھی اسی باب (سمع) سے اور ان ہی (مذکورہ بالا) معنی کے لیے آتا ہے۔ البتہ " یائی " کی صورت میں مصدر " غشایۃ " ہو جاتا ہے۔ مزید فیہ کے باب استفعال سے بھی دونوں مادے ہم شکل (اِستَغشٰی) اور ہم معنی (کپڑا اوڑھ لینا یا لپیٹ لینا) استعمال ہوتے ہیں البتہ، بعض اصحاب لغت (مثلاً اقرب الموارد) کے نزدیک، مزید فیہ کے ابواب افعال، تفعیل اور تفعل (اَغشٰی، غشّٰی، تغشّٰی) صرف یائی اللام مادے سے آتے ہیں — ویسے صرفی تعلیل کے لحاظ سے بھی واوی ہو یا یائی دونوں کی شکل یکساں ہی رہتی ہے۔ اس مادہ (یا ان دونوں مادوں) سے اسماء اور افعال کی متعدد صورتیں قرآن کریم میں وارد ہوئی ہیں — ہر ایک کا بیان اپنے اپنے موقع پر آئے گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

● لفظ " غِشاوَۃ " دراصل تو فعل ثلاثی مجرد کا ایک مصدر ہے۔ پھر مصدر بمعنیٰ اسم الفاعل لیتے ہوئے " غشاوۃ " سے مراد وہ چیز لی جاتی ہے جس سے کسی شے کو ڈھانپنے کا کام لیا جائے یا جو ڈھانپ دینے کا کام دے۔ اور یہ لفظ (غشاوۃ) حسی سے زیادہ معنوی مفہوم کے ساتھ استعمال ہوتا ہے اور خصوصاً آنکھ یا دل کو ڈھانپ لینے۔ یا ان پر " پردہ ڈالنے " کے معنی دیتا ہے۔ ان معنی کے لیے عربی زبان میں یہ لفظ (غشاوۃ) مثلث الغین ہے یعنی اس کی " غ " پر تینوں حرکات (ـَ، ـِ، ـُ) پڑھی جا سکتی ہیں۔ تاہم قرآن کریم میں (خصوصاً روایت حفص میں) یہ لفظ " غ " کی کسرہ (ـِ) سے ہی پڑھا گیا ہے۔ اور مندرجہ بالا مفہوم کو سامنے رکھتے ہوئے اکثر مترجمین نے اس لفظ کا اردو ترجمہ " پردہ " ہی کیا ہے۔ ایک صاحب نے غالباً محاورے کے جوش میں اس کا ترجمہ " گھٹاٹوپ " بھی کر دیا ہے جو بظاہر "غشاوۃ"

سے زیادہ " مُظلِم یا ظلُمات " کا ترجمہ معلوم ہوتا ہے۔

[وَلَهُمْ] میں " وَ " عاطفہ (بمعنی اور) ہے اور " لَهُمْ " میں ضمیر مجرور (هُمْ) سے پہلے لام الجرّ (لِ) ہے جو ضمائر کے ساتھ (یائے متکلّم کے سوا) ہر جگہ مفتوح (لَ) پڑھی جاتی ہے۔ یوں " وَلَهُمْ " کا لفظی ترجمہ بنتا ہے " اور ان کے لیے " (ہوگا یا ہے)

۲:۶:۱(۶) [عَذَابٌ] لفظ " عذاب " کا مادہ " ع ذ ب " اور وزن " فَعَالٌ " ہے۔ اس مادہ سے فعل ثلاثی مجرد مختلف ابواب سے مختلف معنوں کے لیے کبھی لازم اور کبھی متعدّی آتا ہے مثلاً " عذَب یَعذِب عَذْبًا " (باب ضرب سے) کے معنی ہوتے ہیں: " کسی کو روک دینا (مثلاً کہیں گے " عذب فلانا ") اور اسی کے معنی " پیاس کی شدّت کے باعث کھانا یا نیند چھوڑ دینا " بھی ہوتے ہیں (مثلاً کہیں گے " عذَبَ الرجلُ ") اور ایسے آدمی کو " عاذِب " کہتے ہیں۔ عذِب یعذَب عَذَبًا (باب سمع سے) کے معنی " پانی کی سطح پر سبز کائی سی آجانا " ہیں۔ مثلاً عذِبَ الماءُ (پانی کا کائی والا ہونا)۔ اور عذُب یعذُب عَذُوبۃً (باب کرم سے) کے معنی " پانی کا میٹھا (عَذْبٌ) ہونا " ہوتے ہیں۔ ـــــ تاہم قرآن کریم میں اس مادہ (عذب) سے فعل ثلاثی مجرد کہیں بھی اور کسی معنی میں بھی استعمال نہیں ہوا۔

● لفظ " عذاب " جو اس مادہ (عذب) سے ایک جامد اسم ہے اس کے لغوی معنی یوں بیان ہوتے ہیں: " ہر وہ چیز جو انسان پر گراں گذرے اور اسے اس کے ارادوں سے روک دے "[1] اردو میں " عذاب " کا ترجمہ " سزا " یا " مار " کیا جاتا ہے۔ خود لفظ " عذاب " بھی اردو میں مستعمل ہے۔ لفظ عذاب عموماً جسمانی سزا یا مار کے لیے آتا ہے۔ مگر بطور استعارہ کسی سخت تکلیف دہ ذہنی

---

[1] اقرب الموارد۔ راغب نے مفردات میں " عذاب " کے معنی " ایجاع شدید " یعنی سخت درد (دکھ) پہنچانا " بتائے ہیں جو بنیادی طور پر " جسمانی مار " کے لیے ہی ہے۔

اور نفسیاتی کیفیت کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ عربی کا لفظ "عقوبت" بھی عذاب کے ہم معنی اور اردو میں متعارف ہے۔

● "راغب" نے "مفردات" میں عذاب کے ان معنوں کی اصل یا مناسبت کے بارے میں تین چار اقوال بیان کئے ہیں[1]۔ ان میں سے بظاہر یہی (روک دینا یا رک جانا والے) معنی زیادہ مناسب اصل معلوم ہوتے ہیں۔ کیونکہ عذاب کا مقصد سزا پانے والے کو یا دوسروں کو اس کام سے روکنا اور باز رکھنا بھی ہوتا ہے۔ اور چونکہ "سزا دینا" کے لیے عربی میں اس مادہ سے فعل باب "تفعیل" سے (عذّب یعذِّب تعذیباً) آتا ہے۔ اس لئے "راغب" نے کچھ معنوی مناسبتیں اس باب (تفعیل) کی بعض "خاصیات" پر بھی قائم کی ہیں مثلاً اس باب (تفعیل) کی ایک خاصیت "ازالہ (ہٹا دینا)" ہے اس لیے تعذیب (عذاب دینا) کا مطلب "زندگی کی 'شیرینی' (عذب) کو ہٹا دینا" ہے ـــــ یا مثلاً اس باب کی ایک خاصیت "کوئی کام شدت اور کثرت سے کرنا" بھی ہے۔ اس سے ہی "عَذّبه" کے ایک معنی "عَذَبۃُ السوط" (کوڑے کے کناروں) سے بہت زیادہ مارنے کے بھی ہوتے ہیں۔ اردو مترجمین میں سے جنہوں نے "عذاب" کا ترجمہ "مار" کیا ہے، غالباً ان کے سامنے یہی مؤخر الذکر مناسبت تھی۔

● قرآن کریم میں اس مادہ (ع ذ ب) سے صرف باب تفعیل کے کچھ صیغہ ہائے فعل اور متعدد مشتق اور جامد اسماء وارد ہوئے ہیں۔ ان کا بیان اپنے موقع پر ہو گا۔ ان شاء اللہ۔ خیال رہے کہ صرف یہی لفظ (عذاب) مختلف صورتوں (مثلاً معرفہ، نکرہ، مفرد، مرکب شکل) میں تین سو سے زیادہ جگہ (قرآن کریم میں) وارد ہوا ہے۔ اور بیشتر موصوف ہو کر آیا ہے اور اس کی صفت کے طور پر زیادہ تر عظیم، الیم، مہین، مقیم اور شدید وغیرہ کے الفاظ آئے ہیں۔ ان کی وضاحت بھی ان شاء اللہ اپنے اپنے مقام پر ہو گی۔

۲:۶:۱(۷) [**عَظِيْمٌ**] کا مادہ "ع ظ م" اور وزن "فَعِيْلٌ" ہے۔

---

[1] دیکھئے: راغب (المفردات) نیز LANE کی مد القاموس تحت مادہ "عذب"

اس مادہ سے فعل ثلاثی مجرد باب " نصر " سے متعدی اور باب " کرُم " سے لازم آتا ہے مثلاً عظَم یعظُم عظماً (نصر) کے معنی " کسی کی ہڈیوں پر مارنا " یا " کتّے کو ہڈی ڈالنا " ہوتے ہیں ـــــ اور عظُم یعظُم عِظَماً (کرم) کے معنی " بڑا یا عظمت والا ہونا " ہیں ـــ تاہم قرآن کریم میں اس مادہ سے فعل ثلاثی مجرد کہیں بھی، کسی باب سے اور کسی بھی معنی کے لیے نہیں آیا ۔

البتّہ یہ لفظ (عظیم) باب کرم سے صفت مشبّہ بروزن " فعیل " ہے ۔ اور اس کا اردو ترجمہ " بڑا " یا " بہت بڑا " کیا جاتا ہے اور خود لفظ " عظیم " بھی اردو میں رائج ہے ۔ قرآن کریم میں یہ لفظ (عظیم) مختلف صورتوں میں سو سے زیادہ جگہ آیا ہے ۔ اور اس مادہ (عظم) سے باب تفعیل اور افعال کے (صرف تین صیغہ ہائے فعل کے علاوہ متعدد اور مختلف المعنی مشتق اور جامد اسماء بھی وارد ہوئے ہیں ۔ ـــ ان سب کا بیان بھی اپنی اپنی جگہ آئے گا ۔ انشاء اللہ تعالےٰ ۔

ملاحظہ ! یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ آیتِ زیر مطالعہ میں ضمیر مجرور جمع مذکر غائب (ھُم) تین جگہ (قلوبِھِمْ ، سَمْعِھِمْ اور ابصارِھِمْ) ماقبل مکسور ہونے کے باعث " ھِمْ " (بکسر الھاء) پڑھی جاتی ہے ۔ (البتّہ " وَلَھُم " میں وہ اپنی اصلی شکل میں ہے ۔ کیونکہ یہاں اس کا ماقبل مفتوح ہے ۔

۲:۶:۲ الإعراب

(ختم اللہ علی قلوبھم وعلی سمعھم ۔ وعلی ابصارھم غشاوۃ ۔ ولھم عذاب عظیم)

یہ آیت تین جملوں پر مشتمل ہے جو واو العطف کے ذریعے ملائے گئے ہیں ۔ ہر ایک جملے کی ترکیب یوں ہے :-

(۱) [خَتَمَ] فعل ماضی معروف صیغہ واحد مذکر غائب اور [اللّٰہُ] اس کا فاعل (لھذا مرفوع) ہے ۔ علامتِ رفع " اللہ " کی " ھا " کا ضمہ (ـُ) ہے ۔ [علی] حرف الجر ہے جو یہاں فعل (ختَم) کے صلہ کا کام بھی دیتا ہے ۔

[قلوبھم] میں " قلوب " مجرور بالجر (علی) ہے اور "ھم" ضمیر مجرور ہے ۔ اور پورے مرکّب جارّی (علی قلوبھم) کو چاہیں تو متعلق فعل (ختم) سمجھ لیں اور چاہیں تو " علی " کو " خَتَم " کا صلہ سمجھ کر " علی قلوبھم " کو مفعول بہٖ اور (لہٰذا) محلاً منصوب قرار دے لیں۔ دونوں صورتوں میں لفظی اردو ترجمہ " (اللہ نے) مہر کر دی ان کے دلوں پر " ہوگا ۔ اس کے بعد [وَ] واو عاطفہ بمعنی " اور " ہے اور اس کے ذریعے اگلی عبارت (علی سمْعِھم) کا عطف فعل " ختَم " پر ہے یعنی " وَختم علی سمعھم " مراد ہے ۔ اور یہ [علی سَمْعِھم] جس میں " علی " حرف الجرّ اور " سمع " مضاف بھی ہے اور مجرور بالجر بھی — اور آخری " ھم " ضمیر مجرور مضاف الیہ ہے — اور یوں یہ سارا مرکّب جارّی (علی سمْعِھم) بھی " علی قلوبھم " کی طرح جار مجرور متعلق فعل (ختَم) ہے یا مفعول ہونے کی بنا پر محلاً منصوب ہے — " سمْعِھم " میں " سمْع " کے مصدر ہونے اور اس لیے واحد یا جمع کے لیے یکساں استعمال پر بات ہو چکی ہے (۲:۶:۱(۳)) ۔ البتہ بعض نحوی حضرات یہاں " سمع " کو واحد ہی مان کر اس سے پہلے لفظ " مواضع " (جگہیں) مقدر مان لیتے ہیں گویا تقدیر عبارت (دراصل) یوں ہے :" وَعلی مواضعِ سمعھم " (یعنی ان کی سننے کی جگہوں پر) ۔ اور مراد اس سے بھی بہرحال وہی " کانوں پر " ہی ہوگا ۔

● بعض مترجمین نے لفظ " سمع " (واحد) کا لحاظ کرتے ہوئے " علی سمعھم " کا ترجمہ " ان کے کان پر " کیا ہے ۔ تاہم اکثر نے معنی کو ملحوظ رکھتے ہوئے جمع کے ساتھ " ان کے کانوں پر " ترجمہ کیا ہے — بعضؒ حضرات نے اس پوری عبارت (..... علی قلوبھم و علی سمعھم) میں " علی " کی تکرار کا ترجمہ تو کیا ہے مگر ضمیر مجرور (ھُم) کا ترجمہ صرف ایک دفعہ کیا ہے یعنی " ان کے دلوں پر اور کانوں پر " — اور بعضؒ نے اس کے برعکس " ضمیروں " کا ترجمہ تکرار مگر " علی " کا ترجمہ صرف ایک بار کیا ہے ۔ یعنی " ان کے دلوں اور ان کے کانوں پر "

ـــــ جب کہ بعضؒ نے " علی " اور " ھم " دونوں کی تکرار کو چھوڑ کر ترجمہ کیا ہے یعنی " ان کے دلوں اور کانوں پر "۔ ترجمہ کی مندرجہ بالا (آخری تینوں) صورتیں محاورے اور مفہوم کے لحاظ سے درست ہیں مگر ان میں قرآن کریم کی اصل عبارت سے قدرے انحراف ضرور موجود ہے۔ یہاں تک (ختم اللہ ...... سے علی سمعھم تک) پہلا جملہ فعلیہ ختم ہوتا ہے اس کے بعد اگلا جملہ (اسمیہ) شروع ہوتا ہے۔

(۲) [وَ] یہاں واو عاطفہ نہیں بلکہ واو الاستیناف ہے جس سے ایک الگ جملے کی ابتداء ہوتی ہے۔ اگر یہاں بھی " واو " کو عاطفہ مانیں تو [علی ابصارھم] جس میں " علی " حرف الجر، " ابصار " مجرور بالجر نیز مضاف ہے اور " ھم " ضمیر مجرور مضاف الیہ ہے) ـــــ کی حد تک تو بات بن جاتی ہے۔ یعنی اس کا عطف بھی " خَتَمَ اللّٰہ " پر سمجھا جا سکتا ہے۔ اس صورت میں ترجمہ ہوگا ـ " اور ان کی آنکھوں پر (بھی مہر لگا دی) " مگر اس صورت میں اگلا لفظ [غشاوۃٌ] جملہ کی ترکیب میں کسی طرح فِٹ نہیں بیٹھتا ۔ اس لیے ضروری ہوا کہ اس " وَ " کو واو الاستیناف اور اس کے بعد آنے والے جملے کو مستانفہ (الگ جملہ) مانا جائے ۔ اس صورت میں یہ پورا مرکب جارّی (علی ابصارھم) خبر مقدم یا قائم مقام خبر مقدم ہوگا اور " غشاوۃٌ " مبتدا مؤخر نکرہ ہو کر مرفوع ہے (" فی البَیْتِ رَجُلٌ " کی طرح) اور علامتِ رفع آخری " ۃٌ " کے دو ضمہ (ـُـٌ) ہیں اور اسی لیے اسے تنوینِ رفع کہتے ہیں ـــــ اس ترکیب کے مطابق " علی سمعھم " کے بعد وقف ہوگا۔ (جسے اکثر مصاحف میں وقفِ مطلق (ط) سے ظاہر کیا گیا ہے۔ اسی چیز کو ملحوظ رکھتے ہوئے اردو مترجمین نے اس حصۂ آیت (وعلی ابصارھم غشاوۃ) کو الگ جملہ سمجھتے ہوئے اس کا ترجمہ " اور ان کی آنکھوں پر پردہ (پڑا ہوا) ہے " کیا ہے۔ بلکہ لفظ " غشاوۃ " کی تنکیر (نکرہ ہونا) کا تقاضا تو یہ ہے کہ اس کا اردو ترجمہ " ایک پردہ " یا " ایک

بڑا پردہ" سے کیا جائے۔ اس کے بعد تیسرا جملہ شروع ہوتا ہے۔
(۳) [وَلهم] کی "واو" کو استیناف کی واو بھی کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ اس کے بعد ایک الگ جملہ (لهم عذاب عظيم) ہے۔ اور چاہیں تو اُسے واو العطف بھی قرار دے سکتے ہیں۔ اس لیے کہ اس کے ذریعے اس جملے (لهم عذاب عظيم) کا عطف اس سے پہلے جملے (وعلى ابصارهم غشاوة) پر ہے یعنی دونوں جملے " اور " کے ذریعے ملائے گئے ہیں۔ اور اسی نحوی توجیہ کی بنا پر یہاں (یعنی اس دوسری " واو " سے پہلے) بھی وقف کی علامت لکھی جاتی ہے۔ جو بعض مصاحف میں " ز " اور بعض میں " صلے " لکھی ہوتی ہے یعنی " الوقف جائز مع كون الوصل اولى " (یہاں وقف ہو سکتا ہے مگر وصل کا پہلو زیادہ قوی ہے) —— استیناف سمجھیں تو وقف کا جواز نکلتا ہے مگر جملے کے جملے پر معطوف ہونے کی بناء پر وصل کی وجہ بہتر معلوم ہوتی ہے۔

بہرحال [لهم] یہاں بھی جار مجرور مل کر خبر۔ یا قائم مقام خبر۔ مقدم کا کام دے رہا ہے۔ اور [عَذَابٌ] مبتدأ مؤخر نکرہ ہو کر مرفوع ہے (علامتِ رفع " ب " کے دو ضمہ (ـٌ) یعنی تنوین رفع ہے) اور [عَظِيمٌ] اس (عذاب) کی صفت ہونے کی بناء پر ہر لحاظ (حالت۔ جنس۔ عدد اور وسعت ہر لحاظ) سے اپنے موصوف (عذاب) کے مطابق ہے۔

۳:۶:۲ الرسم

(ختم الله على قلوبهم وعلى سمعهم۔ وعلى ابصارهم غشاوة۔
ولهم عذاب عظيم)

[ختم الله] میں لفظِ جلالت (الله) کی اس مخصوص املاء (جو رسم عثمانی اور رسم معتاد۔ دونوں۔ میں یکساں ہے) پر سورۃ الفاتحہ کے شروع میں "بسم الله" کے ضمن میں بات گذر چکی ہے (۱:۱:۲ (۲)) [على] کا رسم املائی اور رسم عثمانی بھی

ـــ دونوں طرح ـــ " لام " کے بعد " یاء " کے ساتھ ہے۔ یعنی یہ پڑھا " عَلا " مگر لکھا " علی " جاتا ہے۔ [قلوبھم] اور [سمعھم] میں ضمیر مجرور متصل (ھم) موصول (ملا کر) لکھی جاتی ہے اور یہ وضاحت اس لیے ضروری ہے کہ (آگے چل کر) بعض جگہ یہ ضمیر " ھم " اپنے ماقبل سے مقطوع (الگ) لکھے جانے کی مثالیں بھی سامنے آئیں گی۔ [وعلی ابصارھم غشاوۃ] میں کلمات " ابصار " اور " غشاوۃ " کا رسم بھی مختلف فیہ ہے۔ تفصیل اس کی یوں ہے :

● بیشتر عرب اور افریقی ملکوں کے مصاحف میں یہ " اَبْصٰر " (بحذف الالف بعد الصاد) اور " غشٰوۃ " (بحذف الالف بعد الشین) لکھے جاتے ہیں۔ سعودی، مصری اور شامی مصاحف میں یہ آپ کو اسی طرح لکھے ملیں گے۔

(۱) لفظ " ابصار یا ابصٰر " قرآن کریم میں مفرد یا مرکب شکل میں انتالیس (۳۹) دفعہ آیا ہے۔ اور بعض علمائے رسم کے نزدیک اس کا عثمانی " رسم " ہر جگہ " ابصٰر " (بحذفِ الف) ہی ہے۔ تاہم دنیائے اسلام کے مشرقی ممالک میں ـــ اور عرب افریقی ممالک میں سے صرف لیبیا میں ـــ اسے ہر جگہ باثباتِ الف (ابصار) لکھنے کا رواج چلا آتا ہے۔ ایران، ترکی، افغانستان، برصغیر اور چین وغیرہ کے مصاحف میں یہی املاء (ابصار) رائج ہے۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ صاحب " نثر المرجان " نے اس لفظ (ابصار) میں اثبات الالف کو اکثریت کا عمل قرار دیا ہے اور " حذف الالف " کو " قِیْل " (کہا گیا ہے) کہہ کر بیان کیا ہے (البتہ انہوں نے اپنے ایک اہم مصدر اور مرجع " قلمی مصحف الجزری " میں اس لفظ کے " محذوف الالف " لکھے ہونے کا ذکر کیا ہے[1]۔ بیشتر عرب اور افریقی ممالک کے مطابق یہ (اثبات الالف) رسم عثمانی کی خلاف ورزی ہے۔ " سمیر الطالبین " میں " حذف الالف بعد الصاد " کے تحت " والبصٰر کیف جاء " (یعنی لفظ " البصٰر " کا ہر

---

[1] نثر المرجان ج ۱ ص ۱۰۶

جگہ محذوف الالف لکھا جانا بیان کیا گیا ہے[1] مگر یہ متفق علیہ قول نہیں ہے۔ راقم الحروف کو پڑتال کرنے پر معلوم ہوا کہ الدانی (" المقنع " میں) اور الشاطبی (" العقیلہ " میں) محذوف الالف کلمات کی بات کرتے ہوئے اس لفظ (البصار) میں حذف کے بارے میں بالکل خاموش ہیں اور یہ خاموشی عدم حذف کو مستلزم ہے۔ البتہ " مورد الظمآن " (للخراز) میں " البصار " کے محذف الالف ہونے کا قول صرف ابوداؤد (سلیمان بن نجاح) کی طرف منسوب کیا گیا ہے[2]

(۲) لفظ " غشاوۃ " کا بھی یہی قصہ ہے یعنی بیشتر عرب اور افریقی ملکوں کے مصاحف میں یہ کلمہ " غِشٰوَۃ " (بحذف الالف بعد الشین) لکھا جاتا ہے اور وہ اسے رسم عثمانی کا اتباع سمجھتے ہیں۔ تاہم عرب اور افریقی ممالک میں سے صرف لیبیا اور تمام ایشیائی (غیر عرب) مسلم ممالک ـــــ کے مصاحف میں یہ لفظ ہمیشہ "غشاوۃ" (باثبات الالف بعد الشین) ہی لکھا جاتا ہے ـــــ یہ لفظ (غشاوۃ) قرآن کریم میں صرف دو جگہ آیا ہے ایک یہاں (البقرہ : ۷) اور دوسرا " الجاثیۃ : ۲۳ " میں ـــــ سورۃ الجاثیۃ والے لفظ کے محذوف الالف ہونے پر تو مؤلف "سمیر الطالبین" نے دونوں ائمہ رسم ـــــ یعنی الدانی اور ابوداؤد ـــــ کا اتفاق بیان کیا ہے[3] اس پر مزید بحث تو اپنی جگہ (الجاثیہ : ۲۳) پر کی جائے گی ـــــ مگر سورۃ البقرہ : ۷ یعنی زیر مطالعہ آیت میں وارد لفظ (غشاوۃ) کے محذوف الالف ہونے پر " الدانی " یا " الشاطبی " سے کوئی تصریح ثابت نہیں ہے۔ البتہ صرف ابوداؤد سے حذف الالف والا قول منقول ہے[4] بلکہ صاحب نثر المرجان نے تو یہاں (البقرہ : ۷) کے بارے میں بھی " اثبات الالف بعد الشین " (یعنی " غشاوۃ " لکھنے) کو " عند الاکثر " کہا ہے۔ اور " خلاصۃ الرسوم " کے حوالے سے "حذفها البعض"

---

[1] سمیر الطالبین للضباع ص ۵۲

[2] دلیل الحیران (شرح مورد الظمآن للمارغنی ص ۶۵

[3] سمیر الطالبین ص ۵۰

[4] دلیل الحیران ص ۸۷

لکھا ہے۔ اور پھر یہ بھی تصریح کی ہے کہ یہاں " الف " کے حذف یا اثبات کے بارے میں الدانی ، الشاطبی ، السیوطی اور مؤلف " خزانۃ الرسوم " میں سے کسی نے بھی واضح طور پر کچھ نہیں کہا ہے[1] اور جب تصریح نہ ہو تو پھر لفظ کو عام معتاد عربی املاء کے مطابق لکھنا درست اور جائز ہے۔

● خلاصۂ بحث یہ ہے کہ ان دونوں کلمات (ابصار اور غشاوۃ) کی مصحف میں کتابت کے بارے میں عرب اور عام افریقی ممالک میں عمل " حذف الالف " پر ہے اور ان کی دلیل ابوداؤد کی تصریح یا ترجیح ہے (جو " مورد الظمآن " میں بیان ہوئی ہے۔ ابوداؤد کی اصل کتاب ابھی تک کہیں طبع نہیں ہوئی) اور تمام مشرقی ممالک اور لیبیا میں اثباتِ الف ہی معمول بہ ہے۔ تاہم دونوں کے نزدیک اس (اثبات) کی وجہ الگ الگ ہے۔ اہلِ مشرق میں یہاں اثباتِ الف کی کوئی واضح دلیل کسی کتاب میں نظر سے نہیں گزری۔ غالباً تساہل کی بناء پر عام معتاد رسم کا رواج ہو گیا اور پھر " عمل الاکثر " بن گیا۔ اور ہو سکتا ہے کہ حذف کے بارے میں " الدانی " اور " الشاطبی " کی خاموشی ہی اس کا باعث بنی ہو —— البتہ اہل لیبیا کی دلیل واضح ہے کہ وہ بصورتِ اختلاف (اور ایک کی خاموشی اور دوسرے کی تصریح بھی اختلاف ہی کی ایک صورت ہے)۔ الدانی کو ابوداؤد پر ترجیح دیتے ہیں[2] اور الدانی کی کتاب " المقنع " میں اس (حذف) کے بارے میں کوئی تصریح نہیں ملتی۔ بلکہ الشاطبی (صاحب العقیلہ) جس کی بنیاد " المقنع " ہی ہے —— وہ بھی اس بارے میں خاموش ہے اور یہی چیز یہاں اثباتِ الف کو مستلزم ہے۔ رہ گئی اس حذف کے بارے میں ابوداؤد کی (طرف منسوب) تصریح تو وہ (اہلِ لیبیا) اسے حجت نہیں مانتے۔

● اس ساری بحث سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ لفظ " صراط "[3] کی طرح

---

[1] نثر المرجان ج ۱ ص ۱۰۶

[2] دیکھیے مصحف الجماھیریہ کا ضمیمہ " التعریف بھذا المصحف "

[3] دیکھیے " الصراط " کے رسم پر بحث سورۃ الفاتحہ : ۶ (۱ : ۱ : ۵ : ۳ (۱) میں)

ان دو کلمات (البصار اور غشاوۃ) کی باثبات الالف کتابت رسمِ عثمانی کی صریح خلاف ورزی نہیں ہے جیسا کہ عرب اور افریقی ملکوں میں خیال کیا جاتا ہے — اور "غشاوۃ" (یا غشوۃ) کے رسم کے سلسلے میں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ یہاں آخری "تا" ہمیشہ مربوطہ (ۃ) لکھی جاتی ہے اور اس لیے بصورت وقف اسے "ھا" (ہ) پڑھا جاتا ہے۔

[وَلَهُمْ] میں حرف الجر (لام) اور ضمیر مجرور متصل ملا کر (موصول) لکھے جاتے ہیں۔ اور یہ وضاحت اس لئے ضروری ہے کہ آگے چل کر قرآنِ کریم میں ایسے کلمات بھی آئیں گے جہاں یہ حرف جر (لِ) ملا کر (موصول) لکھنے کی بجائے الگ (مقطوع) لکھا جاتا ہے۔ اس پر بات اپنے موقع پر ہوگی [عذابٌ] یہ لفظ بالاتفاق باثبات الالف بعد الذال لکھا جاتا ہے۔ رسمِ عثمانی کے علماء نے اس لفظ (عذاب) کے قرآن کریم میں ہر جگہ باثبات الالف لکھے جانے کی تصریح کی ہے[1] یہ لفظ (عذاب) قرآن کریم میں معرفہ نکرہ، مفرد، مرکب مختلف شکلوں میں ۳۲۲ جگہ آیا ہے اور ہر جگہ اسی طرح باثبات الالف ہی لکھا جاتا ہے یعنی اس لفظ کا رسمِ املائی اور رسمِ عثمانی یکساں ہے۔ اسی طرح اگلا لفظ [عظیم] بھی ہر جگہ باثبات الیاء بعد الظاء لکھا جاتا ہے۔ یہ وضاحت بھی بظاہر غیر ضروری معلوم ہوتی ہے مگر قرآن کریم میں بعض اس سے ملتے جلتے کلمات میں یہ "یاء" (ماقبل مکسور) حذف کر دی جاتی ہے۔ اگرچہ پڑھی جاتی ہے۔ مثلاً بعض جگہ "ابراھیم" بحذف الیاء لکھا جاتا ہے۔ اس کا ذکر بھی اپنی جگہ آئیگا۔

۲:۶:۴ الضبط

اختلافِ ضبط کے سلسلے میں اب تک ہم نے جو کچھ لکھا ہے اس میں اکثر یہ بھی لکھتے آئے ہیں کہ فلاں طریقِ ضبط کن ملکوں میں رائج ہے۔ امید ہے کہ قارئین اب تک یہ جان چکے ہیں کہ فلاں طریقِ ضبط فلاں علاقے کے مصاحف کی کتابت میں استعمال ہوتا ہے۔ اصل ضبط کے قواعد کی مجموعی تعداد دس اور پندرہ کے درمیان

---

[1] دلیل الحیران ص ۴۴

بنتی ہے جس میں طریق اعجام (نقطے لگانا) کا فرق بھی شامل ہے۔ اس لیے اب ہم ملکوں اور علاقوں کا (بار بار) ذکر کرنے کی بجائے زیرِ مطالعہ قطعۂ آیات (پیراگراف) کے کلمات میں ضبط کے اختلاف کے مواقع اور صورتِ اختلافِ ضبط کا ذکر کر دیا کریں گے ـــــ مثلاً آیت زیرِ مطالعہ میں اختلافِ ضبط کی حسب ذیل صورتیں موجود ہیں :

(۱) ھمزۃ الوصل کی علامت ڈالنا یا نہ ڈالنا ـــ اس کی مثال اسمِ جلالت " الله " کے ضبط میں ملے گی۔

(۲) ھمزۃ القطع کی علامت قطع ڈالنا یا نہ ڈالنا۔ اس کا نمونہ " ابصارھم " کے ضبط میں آئے گا۔

(۳) " واو ساکنہ " ماقبل مضموم کی علامت سکون ڈالنا یا نہ ڈالنا۔ اس کا اثر " قلوبھم " کے ضبط میں ظاہر ہوگا۔

(۴) یائے ساکنہ ماقبل مکسور پر علامتِ سکون ڈالنا یا نہ ڈالنا اور اس ماقبل پر کسرہ ظاہر کرنے کا فرق۔ اس کی مثال کلمہ " عظیم " کا ضبط ہوگا۔

(۵) الف ماقبل مفتوح پر علامتِ فتحہ یا علامتِ اشباع (ـا) ڈالنے کا فرق ـــ اس اختلاف کا اثر کلمات " ابصارھم، غشاوۃ اور عذاب " کے ضبط میں ظاہر ہوگا۔

(۶) الف محذوفہ (یا مقصورہ) کے ضبط کا فرق کلمات " علی " اور " البصار " اور " غشاوۃ " (بصورت حذف الالف) کے ضبط میں نمایاں ہوگا۔

(۷) اسمِ جلالت " الله " کے ضبط اور علامتِ اشباع ڈالنے یا نہ ڈالنے کا فرق

(۸) تنوینِ اظہار اور تنوینِ اخفاء کی کتابت مختلف یا یکساں ہونا۔ تنوینِ اظہار کا نمونہ کلمہ " عذاب " میں اور تنوینِ اخفاء کا نمونہ یہاں کلمات " غشاوۃ " اور " عظیم " کے ضبط میں سامنے آئے گا۔

(۹) تنوینِ اخفا کے بعد " یرملون " کے کسی حرف کے ادغام کی علامت (بصورت تشدید) ڈالنا یا نہ ڈالنا۔ یہ فرق " غشاوۃ " کے بعد " ولھم " میں ظاہر ہوگا۔

(۱۰) قلقلہ کے لیے مخصوص علامت سکون کلمہ " ابصارھم " کی " ب " پر ظاہر ہوگی۔

(۱۱) "سالد" کی ترقیق یا تفخیم کے لیے الگ الگ صورت "ر" یا "ر" استعمال
کرنا ـــ یہاں ابصارِھم کی "ر" اس کی ترقیق کو ظاہر کرے گی۔

(۱۲) اسم جلالت "اللہ" کی لام کی تفخیم کے لیے مخصوص علامت اشباع ۔ مندرجہ بالا
ہر سہ طریق ضبط (۱۰، ۱۱، ۱۵) صرف تجویدی قرآن مطبوعہ پاکستان کی خصوصیت
ہیں۔

(۱۳) افریقی ممالک کے "ف" اور "ق" کے طریق اعجام (نقطے لگانے) کا فرق
کلمہ "قلوبھم" کی کتابت میں سامنے آئے گا۔

● اس طرح آیت زیر مطالعہ کے کلمات میں اختلاف ضبط کی مندرجہ ذیل "مضبوط"
صورتیں بنتی ہیں۔ جن کلمات کے ضبط میں کوئی اختلاف نہیں (سوائے اس کے کہ حرکات کی
شکل مختلف ہوں یعنی زبر، زیر، پیش لکھنے کا انداز مختلف ہے۔ ان کلمات کو لکھنے کی
ضرورت نہیں مثلاً یہاں "سَمْعِهِمْ"، "خَتَمَ" اور "لَهُمْ" کا ضبط
ہر جگہ اور ہر ملک میں یکساں ہے ـــ باقی کلمات میں اختلاف ضبط کی بناء پر حسب
ذیل نمونے ملتے ہیں:-

اللّٰهُ ، اللّٰهُ ، ٱللَّهُ ، أللّٰهُ ، اَللّٰهُ

عليٰ ، عَلَىٰ ـــ قُلُوْبِهِمْ ، قُلُوبِهِمُ

قُلُوبِهِمْ ـــ اَبْصَارِهِمْ ، أَبْصَارِهِمْ ، اَبْصَارِهِمْ ،

اَبْصَارِهِمْ ، ءَابْصَٰرِهِمْ (بصورت حذف الف)۔

غِشَاوَةٌ ، غِشَاوَةٌ ، غِشَاوَةٌ ، غِشَٰوَةٌ (بصورت حذف الف)

وَ ، وَ ـــ عَذَابٌ ، عَذَابٌ ، عَذَابٌ۔

عَظِيمٌ ، عَظِيمٌ ، عَظِيمٌ ، عَظِيْمٌ ـــ

"قرآن حکیم قرنِ اوّل میں اور اس کے بعد"
ایک بلیغ اشارہ

ڈاکٹر ظہور احمد اظہر
صدر شعبۂ عربی، جامعہ پنجاب

یہ مقالہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے زیرِ اہتمام
سالانہ محاضراتِ قرآنی (مارچ ۱۹۹۰ء)
بعنوان: "دعوت رجوع الی القرآن کا منظر و پس منظر" کے موقع پر پیش کیا گیا

قرآن کریم کا نزول اور ظہور اسلام اس کائنات ارضی کی مدوّن تاریخ کا سب سے زیادہ اثر انگیز و فیصلہ کن اور سب سے زیادہ دور رس نتائج کا حامل واقعہ ہے۔ قرآنی وحی ربانی کے آغاز کے لمحہ کو رب کائنات نے یوم الفرقان یعنی حق و باطل کے درمیان حدِّ فاصل کھینچ دینے والا لمحہ قرار دیا اور اس لمحہ والی رات کو لیلۃ القدر یعنی انسانیت کا مقدر جگانے والی مبارک رات قرار دیا ہے۔ اس سراپا برکت سرمدی و عظمتِ جاوید والے لمحہ کی رات کو راتوں، دنوں یا ہفتوں سے نہیں بلکہ مہینوں سے بھی افضل و برتر رات فرمایا گیا کیونکہ وقت کی جوئے رواں کے لامحدود لمحات اپنی ذات میں کچھ بھی نہیں، ان کا گزرنا نہ گزرنا برابر ہے۔ ان لمحاتِ ہر دم دواں و پیہم رواں کی زندگی اور وجود فقط ان نقوش سے ہی عبارت ہے جو ان کا حوالہ بن کر تاریخ کے حافظہ میں ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو گئے۔ یہ نقوش دراصل وہ اعمال اور کارنامے ہیں جو اس کائنات ارضی پر انسانیت کے حوالے سے انجام پذیر ہوئے۔ اعمال اور کارناموں کے یہ نقوش جس قدر

مضبوط، دور رس اور دائمی ہوئے اسی قدر ان سے انسانیت متاثر ہوئی اور جس قدر ان سے انسانیت متاثر ہوئی اسی قدر ان کی اہمیت وقدر وقیمت کا تعین ہوا، اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو نزول قرآن کریم کے آغاز کا لمحہ، جو رات کے حوالے سے لیلۃ القدر کہلایا اور دن کی نسبت سے یوم الفرقان یا یوم القرآن کہلانے کا مستحق ٹھہرا، کائنات ارضی پر انسانیت کی تاریخ کا سب سے زیادہ اثر انگیز وفیصلہ کن اور سب سے زیادہ دور رس نتائج کا حامل لمحہ ہے کیونکہ اسی دن تو انسان کی تمام سعادتوں اور عظمتوں کا ضابطہ حیات سامنے آیا اور اسی لئے اس ضابطہ حیات کی تکمیل کو اللہ رب العزت کے انعام سرمدی کی تکمیل قرار دیا گیا- اس لمحہ پر اور اس انعام پر انسانیت جس قدر بھی ناز کرے کم ہے-

اس زندۂ جاوید کتابِ مقدس کا پیغام حکمت، ازل سے ابد تک کی قدیم اور جدید تمام حکمتوں کا جوہر اور ان کی تکمیل ہے، گویا رہنمائی کے لئے ابن آدم کو حکمتِ ربانی کی شکل میں جو کچھ درکار تھا مل گیا- یہ انسانیت کے نام خدا کا آخری پیغام ہے جو جامع و اکمل بھی ہے اور نسخۂ ہدایت ابدی بھی - اس کا نظامِ عدل چونکہ کائنات کی روحِ اعتدال و توازن کا ترجمان ہے اس لئے ہر زمان و مکان میں قابل عمل بھی ہے- اس کتاب مبین کے یہی امتیازات ہیں جو اس کی حکیمانہ تعلیمات کو ابدی و دائمی ہونے کا شرف عطا کرتے ہیں، بقول حکیم الامت ۔

آن کتابے زندہ قرآنِ حکیم ، حکمتِ او لایزال است و قدیم

قدیم ولایزال حکمت ربانی کی حامل اس کتاب زندہ کا درس اول چونکہ تخلیق آدم کے اعجاز خداوندی کے ساتھ ساتھ علم و قلم کی عظمت پر مشتمل ہے اس لئے اس کے لانے والے نے علم کی روشنی کو انسان کا محض حق قرار نہیں دیا کہ اس سے دست بردار ہو کر سبکدوش ہو جائے بلکہ زیور علم سے آراستہ ہونے کو ہر مرد و زن کا فریضہ منصبی قرار دیا، اس لئے امتِ قرآن کا جہالت کی تاریکیوں میں بھٹکنا نامعقول و ناممکن سی بات ہے- اس کتاب نے درسِ توحید کے ساتھ وحدتِ نسل انسانی، مساوات، اخوتِ اسلامی اور احترام آدمیت کے علاوہ بھوک اور غلامی سے انسانیت کو نجات دلانا اولاد آدم میں سے ہر فرد کا حقیقی مشن اور مقصد اصلی قرار دیا ہے- الغرض یہ اور اسی

قسم کے حقائق زندگی ہیں جو قرآن کریم سے قبل کسی کو معلوم تک بھی نہ تھے کوئی ان کا قائل تو کیا ہوتا' مگر یہی قرآنی حقائق زندگی ہیں جو آہستہ آہستہ مسلم عالمی صداقتیں قرار پا گئیں اور آج یہی عالم انسانیت کا منشور حقوق بن گیا ہے گویا شعوری اور لاشعوری طور پر انسانیت قرآنی صداقتوں پر ایمان لاتی جا رہی ہے' ظاہر ہے جس کتاب کی یہ حقیقی اہمیت ہو مگر لوگ اس کے نہ صرف منکر ہوں بلکہ اس سے آگاہ بھی نہ ہوں تو اس کتاب حق کی طرف رجوع کی دعوت ہر مسلمان کے لئے بالخصوص اور ہر انسان کے لئے بالعموم بے حد مبارک اقدام بلکہ وقت کا تقاضا ہے اور اس دعوت کا داعی تحسین و تبریک کا مستحق ہے' ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے اس مبارک و مقدس کام کے لئے اپنی زندگی کو وقف کر کے وقت کی آواز پر لبیک کہا ہے اس لئے ان کی اس دعوت پر لبیک کہنا امت کا بھی فرض بنتا ہے۔

"دعوت رجوع الی القرآن کا منظر و پس منظر" ڈاکٹر صاحب کی تقاریر و تحریرات کا مجموعہ ہے جو مختلف اوقات کی مناسبت سے سامنے آتی رہی ہیں۔ فاضل مصنف نے اپنے اس مجموعہ میں شامل تحریروں میں سے چھٹے باب کو اپنی محبوب ترین تحریروں میں سے ایک تحریر شمار کیا ہے جیسا کہ دیباچۂ کتاب سے واضح ہوتا ہے یہ باب دراصل مہجوریٔ قرآن اور اس کے المناک نتائج کی داستان پر مشتمل ہے لیکن یہ داستان جتنی طویل ہے اس کے مقابلے میں یہ باب اتنا ہی مختصر بلکہ مجمل ہے۔ فاضل مصنف کو خود بھی اس کا احساس ہے ان کی رائے یہ ہے کہ بعض طبعی و منطقی اسباب کے نتیجے میں قرن اول ہی سے مہجوریٔ قرآن کا آغاز ہو گیا تھا۔ میں بھی ڈاکٹر صاحب سے کسی حد تک اتفاق کرتے ہوئے اسی مختصر باب کی طویل داستان کو موضوع بنا رہا ہوں مگر میری گفتگو بھی مختصر اور تشنہ ہی رہے گی' اس لئے کہ مہجوریٔ قرآن کی یہ داستانِ الم اپنے ابعاد' اسباب اور نتائج کے اعتبار سے ضخیم مجلدات کی مقتضی ہے' یہ کام وقت کے ساتھ مجہودِ جبّار کا بھی محتاج ہے۔ شاید اللہ تعالےٰ اپنے کسی نیک بندے کو اس کی توفیق ارزانی فرمائے' بہر حال اپنی علمی بے بضاعتی اور وقت کی تنگ دامانی کے باوصف "ما لا یدرک کلّہ لا یترک کلّہ" کے اصول پر عمل پیرا ہوتے ہوئے اختصار و اجمال کے ساتھ اس موضوع پر کچھ کہنے سے پہلے ایک دو باتیں عرض کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے جن کا تعلق

موضوع، فاضل مصنف اور میرے ذاتی تاثر سے ہے۔

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی تقاریر اکثر و بیشتر میں نے ٹیلی ویژن کے توسط سے ہی سنی ہیں، براہ راست جلسہ گاہ یا منبر مسجد سے انہیں سننے کا بہت ہی کم موقع ملا ہے۔ ان کی تحریریں بھی پڑھیں مگر کم کم لیکن ان سے جو سنا اور ان کا جو کچھ لکھا ہوا بھی پڑھا ہے اس سے دو باتیں واضح طور پر سامنے آئیں، ایک تو یہ کہ ان کی بات دل سے نکلتی ہے اس لئے اثر بھی رکھتی ہے، دوسری بات یہ نظر آئی ہے کہ ان کا دماغ بھی ان کے دل کا ساتھ دیتا ہے۔ جو بات وہ قاری یا سامع تک پہنچانا چاہتے ہیں وہ نوک زبان سے ہو یا زبان قلم سے وہ ہوتی بالکل واضح ہے، فصاحت و بلاغت کی دنیا میں اسے اظہار مافی الضمیر پر کامل قدرت سے تعبیر کیا جاتا ہے، ان کے تحریری و تقریری اسلوب بیان میں ادب و شعر کی چاشنی بھی ہوتی ہے جو بات کو مؤثر اور دلچسپ بنانے میں بڑا کام کرتی ہے۔ اس ضمن میں انہوں نے فہم و تفہیم قرآن کے سلسلے میں اپنے جو ابعادِ اربعہ ذکر کئے ہیں اور جن کی خوشہ چینی کا انہوں نے برملا اعتراف کیا ہے ان میں دو ابعاد کا اضافہ ہو سکتا ہے۔ پیرِ رومی اور لسان العصر اکبر الہ آبادی کے نقوش بھی ڈاکٹر صاحب کی تحریر و تقریر میں جابجا نظر آتے ہیں گو اس مقدار میں نہ سہی جو ابعاد اربعہ کے اثرات کے ضمن میں مسلم و معترف بہ سمجھی گئی ہے۔

ایک اچھے خطیب و ادیب کے لئے اپنے موضوع پر کامل گرفت کا ہونا بھی ضروری ہے۔ موقع کی مناسبت سے مطلوبہ شرائط کے اندر رہتے ہوئے اپنی بات کو قاری و سامع تک پہنچا دینے کی قدرت فصحاء و بلغاء کے کمالات میں سر فہرست ہے۔ بعض لوگوں کو بات شروع کرنا نہیں آتا اگر آغاز پر قادر بھی ہو جائیں تو بات بڑھانے سے قاصر رہتے ہیں مگر بعض اوقات یوں ہوتا ہے کہ آغاز بھی ہو گیا سلسلہ گفتگو بھی بڑھنا شروع ہو گیا مگر بات کو سمیٹنے اور نقطۂ اختتام پر پہنچنے میں عجز محسوس ہوتا دکھائی دیتا ہے لیکن ڈاکٹر اسرار صاحب بات شروع کرنا، اسے آگے بڑھانا مگر مقدار سے آگے نہ بڑھنا اور حرف آخر پر پہنچ کر دل نشین انداز میں بات ختم کرنا بھی جانتے ہیں۔ یہ کام موضوع پر کامل دسترس، نفس مضمون پر پوری گرفت اور سب سے بڑھ کر وضوحِ ذہنی یا منطقی اندازِ ترتیب میں بات کو کھول کر رکھنے پر قدرت کا بھی محتاج ہے۔

عرب کا خود بین و خود پسند اور منہ زور شاعر احمد بن الحسین المتنبّی یہ دعویٰ کیا کرتا تھا کہ جب وہ شعر کہتا ہے تو زمانہ اس کا کلام گنگنانے لگتا ہے (اذا قلتُ شعرا اصبح الدھر منشدا) ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کا اگرچہ ایسا کوئی واضح دعویٰ سامنے تو نہیں آیا البتہ یہ ایک حقیقت ہے کہ ابلاغ قرآنی کی جو طرح انہوں نے ڈالی ہے اس کا ردِّ عمل ہمیں متنبّی کی یاد دلاتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی تقلید میں بہت سے لوگوں نے ابلاغِ قرآنی کو اپنا شعار کیا اور "طرحِ اسراری" کے راستے پر گامزن ہوئے مگر یا تو تھک کر ہار گئے یا شہرت کی بدہضمی کا شکار ہو کر بھٹک گئے مگر ڈاکٹر صاحب نہ تھکے نہ بھٹکے البتہ قبل از وقت فریضۂ منصبی سے سبکدوشی کے اشارے ضرور مل رہے ہیں حالانکہ "ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں!"

یہ تو تھیں چند باتیں جو موضوع سے مناسبت رکھنے کے باوجود بھی بے تعلق سی ہیں مگر ضروری فائدے سے خالی نہ ہوں گی۔ اب کچھ بات ہو جائے چھٹے باب کی۔ فاضل مصنف نے اپنی اس ایک محبوب ترین تحریر میں "بحر فی می تواں گفتن تمنائے جہانے را" سے کام لیتے ہوئے دریا نہیں بلکہ سمندر کو کوزے میں بند کرنے کی کوشش کی ہے لیکن دریا ہو یا سمندر محاورے کے لحاظ سے تو کوزے میں شاید آجاتے اور بند ہو جاتے ہیں اسی طرح شاعرانہ شوخی سے سارے جہان کی تمنا بھی ایک حرف میں سمٹ سکتی ہے مگر دریا دریا ہے اور سمندر سمندر رہے دونوں میں سے کسی کو کوزے میں سمونا ممکن نہیں البتہ اجمالی اشارات ممکن ہیں، ڈاکٹر صاحب نے بھی اجمالی اشارات سے کام لیتے ہوئے موضوع کے وجود اور اس کی اہمیت کا احساس دلا دیا ہے۔ اب یہ کسی باہمت و صاحب توفیق انسان کا مقدر ہو گا جو اس کے منظر و پس منظر کی تفاصیل و جزئیات کو سامنے لائے، تاہم یہ "اسراری اشارہ" اپنے اجمال اور اختصار کے باوجود ہے بہت بلیغ! بھلا قرآن کریم، جہاد فی سبیل اللہ، مجوریٔ قرآن و اس کے نتائج اور پھر رجوع الی القرآن کی دعوت سے بڑھ کر زیادہ بلیغ اشارہ اور کیا ہو گا؟ دین و دنیا کی فلاح اور خسارہ کا حساب کتاب تو اسی بلیغ اشارہ میں موجود ہے! غالباً اسی بلیغ اشارہ کی بنیاد پر ڈاکٹر صاحب اپنی اس مختصر تحریر کو اپنی محبوب ترین تحریروں میں شمار کرتے ہیں اگر یہی بات ہے تو پھر یہ تحریر بلاشبہ محبوب ترین تحریروں میں شمار ہونے کا پورا پورا بلکہ حقیقی

استحقاق رکھتی ہے' موضوع کی اہمیت و عظمت' علوِشان اور انسانی فائدہ و منفعت کے لحاظ سے اس تحریر کا اپنا ہی مقام ہے!

اگر میں ڈاکٹر اسرار صاحب کے اس بلیغ اشارہ کو صحیح سمجھ سکا ہوں تو اسے اجمال و اختصار کے ساتھ یوں واضح کیا جاسکتا ہے کہ فاضل مصنف کے نزدیک تحریک اسلامی کا نظریاتی ضابطہ قرآن حکیم تھا اور اس نظریاتی ضابطہ کا عملی و تطبیقی یا اطلاقی نمونہ نبوی طریق کار تھا جسے جہاد فی سبیل اللہ کی ترکیب میں بیان کیا جاسکتا ہے' مگر امت کے لوگوں سے جہاں یہ نظریاتی ضابطہ اوجھل ہو گیا وہاں وہ اس نبوی طریق کار کو بھی فراموش کر بیٹھے' اب بھی نہ صرف امت مسلمہ بلکہ نوع انسانی کی فلاح دارین اسی ضابطہ زندگی کو اپنانے اور اسی نبوی طریق کار کو اختیار کرنے میں مضمر ہے۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں جو تحریک اسلامی اٹھی تھی وہ اپنے اسباب و اثرات کے علاوہ اپنی اٹھان اور کامیابی میں بھی بے مثال تھی' بلکہ اگر یہ کہا جائے تو زیادہ صحیح اور مناسب ہو گا کہ اس کرۂ ارضی پر انسانیت کی معلوم تاریخ میں پہلے کبھی کوئی تحریک ہی نہ اٹھی تھی چہ جائیکہ ہم اس تحریک کی مثالیں تلاش کرتے پھریں' بلکہ بعد کے زمانوں میں اس تحریک کی نظیر بھی نہ لائی جاسکی بقول متنبیؒ:

مَضَتِ الدُّھُورُ فَمَا اَتَینَ بِمِثْلِہٖ وَلَقَدْ اَتٰی فَعَجَزْنَ عَنْ نُظَرَائِہٖ

ترجمہ: زمانے بیت گئے مگر ان بیتے زمانوں میں اس کی مثال نہ تھی اب وہ آچکا تو زمانے اس کی نظیر لانے سے بھی عاجز ہیں!

غار حراء سے پھوٹنے والی روشنی کی کرن سے پہلے کسی نبی' کسی رسول' کسی مصلح' کسی بانیٔ مذہب یا کسی قائدِ قوم نے ایسی تحریک نہ شروع کی' آپؐ سے پہلے کا ہر نبی اور رسول اپنی اپنی قوم کو ایک ہی بات سمجھاتے سمجھاتے گزر گیا کہ صرف اللہ کی عبادت کرو۔ ہر بانی مذہب اور ہر مصلح دینی کا دائرہ عمل مذہبی رسوم کی تلقین و اصلاح تک محدود رہا' یا اگر کوئی قائد قوم و سپہ سالار روم و یونان اور ہند و ایران سے اٹھا تو تباہی اور بربادی کے طوفان کی طرح اٹھا اور اپنے پیچھے ویرانی اور کھنڈرات چھوڑ گیا۔ مگر غارِ حراء سے پھوٹنے والی سرمدی روشنی کی کرن ایک ہمہ جہت تغیر و تبدیلی اور ہمہ گیر انقلاب تھا' یہ ایک ٹوٹل چینج (Total Change) تھی' مگر اس ہمہ جہت تغیر و

تبدیلی اور ہمہ گیر انقلاب کا امتیاز اعتدال و توازن تھا' اس کی نرم روی شفقت مادری سے زیادہ خوشگوار تھی اور اس کی سخت گیری ایک ہمدرد و ماہر سرجن کے آپریشن سے زیادہ نفع بخش و صحت مند تھی' تحریک اسلامی کے بعد کرۂ ارضی پر اٹھنے والی ہر انسانی تحریک بلاشبہ اس تحریک اسلامی کی خوشہ چین تھی مگر کبھی اس انتہا پر کبھی اُس انتہا پر ہونے کی وجہ سے لولی لنگڑی ثابت ہوئی اور بالآخر اپنے بانیوں اور کارکنوں کا ماتم کرتی ہوئی تاریخ کے تاریک گوشوں میں گم ہو گئی۔ اس کی آخری اور تازہ ترین مثال کمیونزم ہے جو ناکامی کے بعد حسرت و ندامت کے آنسو بہاتے ہاتھ ملتے اور اپنے بانی کا ماتم کرتے ہوئے تاریخ کے تاریک گوشوں میں کھو جانے کے لئے پابہ رکاب ہے!

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے بالکل درست فرمایا ہے کہ تحریک اسلامی کے دو ستون تھے ایک نظریاتی ضابطۂ حیات کا ستون جسے قرآن کریم کہتے ہیں اور دوسرا عملی یا تطبیقی ستون جسے جہاد فی سبیل اللہ کہا گیا' تحریک اسلامی کی قوت میں یہ ثنویت اعتدال و توازن کی ضامن تھی' نظریہ کے ساتھ عمل نہ ہو تو نظریہ بیکار ہے بلکہ بے ثمر درخت ہے۔ اسی طرح اگر عمل کسی صحت مند نظریاتی اصول پر مبنی نہ ہو تو وہ بھی بے جان اور بے فائدہ ہے بلکہ جڑوں سے محروم درخت ہے ایسے درخت سے کسی پھل کی امید احمقانہ توقع کے سوا کچھ نہیں' عقیدہ و ایمان کے ساتھ عمل یا نظریہ کی عملی تطبیق دراصل اعتدال و توازن کے اس نظام کی ترجمانی و تعبیر ہے جس اعتدال و توازن پر کائنات کا نظام چل رہا ہے۔ اس اعتدال و توازن میں خلل قیامِ قیامت کا دوسرا نام ہے۔ اسی طرح قوم کی زندگی میں اعتدال و توازن سے بقائے حیات و ترقی وابستہ ہے یا فرد کے جسم و جان کے نظام میں اعتدال و توازن کا مطلب تسلسل حیات ہے چنانچہ جب قوم میں اعتدال و توازن مفقود ہوتا ہے تو زوال و انحطاط کی سیڑھیوں سے لڑھکتے پھسلتے ادبار و انعدام کے مراحل آتے ہیں اور جسم انسانی جب اعتدال و توازن سے محروم ہوتا ہے تو امراض و اسقام کے بعد موت کی آغوش میں جانا ہوتا ہے۔

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے اس مختصر سے باب میں جن مسائل کو چھیڑا ہے ان میں سر فہرست قرآن کریم ہے جو تحریک اسلامی کا پہلا بنیادی ستون ہے جو نظریاتی ضابطہ کی حیثیت رکھتا ہے اس کے متعلق گزشتہ سطور میں اجمالی باتیں آ گئی ہیں جن کا

تکرار باعث ملال ہو گا' مگر قرآن کریم سے دوری کے اسباب کا کھوج لگانے کے لئے عملی طریقۂ کار کی ایک مثال پیش کرنا فائدہ سے خالی نہیں ہو گا اور اس سے یہ اندازہ بھی ہو جائے گا کہ امت نے دانستہ نہیں بلکہ لاشعوری طور پر یا دشمنوں کی سازش و ملمع سازی سے جو لغزشیں کھائی ہیں ان میں قرآن سے دوری سر فہرست ہے' جیسا کہ اشارہ گزر چکا ہے کہ تحریک اسلامی کے بنیادی نظریاتی ستون کا نقطۂ آغاز تخلیق انسان کی کرشمہ سازی و اعجاز ربانی کے تذکرہ کے ساتھ ساتھ علم و قلم کی عظمت کا اعلان بھی تھا۔ قرآن کریم میں علم کی اہمیت نے امت مسلمہ کو شمع علم کا پروانہ بنا دیا اور شیخ شیراز جب علم کی راہ میں شمع کی طرح پگھلنے کی نصیحت کر رہے ہوتے ہیں تو اس میں یہی قرآنی نقطۂ نظر سامنے ہوتا ہے' اسی کتاب زندہ و منبع حکمت کے طفیل بقول سیوطی اسلام میں سینکڑوں علوم وجود میں آئے۔ ملت اسلامیہ میں علوم کی ایجاد کا سلسلہ اور تعلّم و تعلیم کا مشغلہ کارِ فضیلت ٹھہرا مگر امت ایجاد و توسیع علوم کے میدان میں جس قدر آگے بڑھتی گئی اسی قدر ان علوم کے محرک اول و سرچشمۂ حقیقی قرآن مجید سے دور سے دور تر ہوتی گئی حتّٰی کہ کسی کو یہ احساس تک بھی نہ رہا کہ ان علوم کا اصل و حقیقی سرچشمہ کبھی قرآن کریم ہی تھا۔

جس طرح مسلمانوں کا سرمایۂ علم جب یورپ کے ہاتھ لگا اور اس نے اس سرمایہ کی بنیاد پر اپنی دکان علم سجائی تو اسے اتنا اونچا لے گیا کہ آج انہیں بھی یہ باور کرانے کی ضرورت پیش آ رہی ہے کہ ان کے دنگ کر دینے والے علوم کی دکان میں جو چمک دمک ہے وہ مسلمانوں کے علوم کی مرہون منت ہے اسی طرح مسلمانوں کے یہ علوم قرآن مجید کے مرہون منت ہیں' یہ علوم جس قدر قرآن سے دور ہوتے گئے اسی قدر بشریت کے لئے نفع بخش و سود مند ہونے کے بجائے ضرر رسانی کا شیطانی وسیلہ بنتے گئے۔ اس لئے آج اگر ہم پھر اس انسانی سرمایہ علم کا رشتہ قرآن کریم سے جوڑ سکیں "تو علم را بر تن زنی مارے بود" کے بجائے "علم را بر جاں زنی یارے بود" کی صورت بنتی جائے گی۔ اس لئے دعوت رجوع الی القرآن کے ضمن میں مسلم سائنسدانوں کا نقطہ نظر بدلنا ہو گا۔ ہر سائنسی میدان کے لئے درس گاہیں قائم کرنا اور علماء تیار کرنا ہوں گے تاکہ ہر علم و فن کا ماہر اپنے علم و فن کی قرآنی بنیاد سے آگاہ ہو' صرف اسی صورت میں علم کو

صحیح راہ پر ڈالا جاسکے گا ورنہ حوادث و تغیرات کے تنوّع و تلاطم کی زد میں آنے والی دنیا محدود دروس قرآن سے مستفیض ہونے کا وسیع موقع نہ پاسکے گی اور یوں دعوت رجوع الی القرآن کے لئے ہمہ جہت اثرات اور ہمہ گیر انقلاب پیدا کرنا مشکل ہو جائے گا۔

فاضل مصنف نے مہجوریٔ قرآن کی جس داستانِ الم کی طرف متوجہ کیا ہے اس کے اسباب نتائج اور اثرات کے لئے صفحات و ابواب نہیں بلکہ اجزاء و مجلّدات درکار ہیں مگر مجھ جیسے کم علم و بے بضاعت کے پاس حکیم الامت کے اس ارشادِ درد انگیز کے سوا کہنے کو یا لکھنے کو کچھ نہیں کہ:

وائے ناکامی متاع کارواں جاتا رہا کارواں کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا!

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے اپنی اس محبوب ترین تحریر میں جو خوبصورت ترین بات کہی ہے وہ تحریک اسلامی کے دوسرے ستون یعنی عملی تطبیق کے نبوی طریق کار یا جہاد فی سبیل اللہ کی اقسام کی طرف متوجہ کرنے کی کوشش ہے' جہاد فی سبیل اللہ سے عموماً اور اکثر و بیشتر ایک محدود قسم یعنی قتال فی سبیل اللہ یا زبان نبوت میں جہاد اصغر مراد لیا جاتا ہے لیکن یہ سمجھنے سمجھانے کی کوشش نہیں کی گئی کہ نبوی طریق کار یا جہاد فی سبیل اللہ کے کئی ابعاد و اقسام ہیں' پہلی قسم لسان نبوت میں افضل الجہاد کی ہے اور یہ انسان کا اپنے نفس امّارہ بالسوء کے خلاف جہاد ہے' تزکیہ نفس اور تعمیر شخصیت یا دوسرے لفظوں میں سیرت سازی کا یہ مرحلہ خشت اول کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر یہی ٹیڑھی ہو تو اوج ثریا تک جانے والی دیوار جہاد بھی ٹیڑھی رہ جائے گی' جہاد فی سبیل اللہ کا دوسرا میدان جہاد اکبر کہلاتا ہے' مجاہدۃ البناء الاجتماعی یا تعمیر معاشرہ کا جہاد بڑا وسیع اور کٹھن میدان ہے' جہاد کا یہی مرحلہ نہی عن المنکر اور امر بالمعروف' دعوت و تبلیغ' خدمت خلق اور عالم بشریت کو ہلاکتوں اور آلائشوں سے نجات دلانے جیسے اہم و خوبصورت عناوین رکھتا ہے۔ امام علی المتقی رحمۃ اللہ علیہ نے 'کنز العمال' میں روایت کیا ہے کہ ہادیٔ برحق صلی اللہ علیہ وسلم کسی غزوہ سے واپس تشریف لائے اور مدینۃ النبی میں قدم رکھا تو زبان حق ترجمان پر یہ کلمات رواں تھے:

رجعنا من الجہاد الاصغر الی الجہاد الاکبر

یعنی غزوہ کے جہاد اصغر سے واپس آگئے ہیں اب ہمارے سامنے جہاد اکبر یعنی اصلاح و

تعمیرِ معاشرہ کامیدان ہے' جہاد کاتیسرا میدان قتال فی سبیل اللہ ہے جو جہاد اصغر ہے اور قلیل الوقوع ہونے کے اعتبار سے تو جہاد اصغر ہے مگر عظیم الشان قربانی یا نذرانۂ جاں پیش کرنے کے باعث شہادت عظمٰی کا وسیلہ ہے' درحقیقت یہ جہاد اکبر ہی کا ایک حصہ یا شاخ ہے' یعنی وہ وقت جب منکر کے خلاف طاقت کے استعمال اور تلوار اٹھانے کا مرحلہ درپیش ہوتا ہے!

نبوی طریق کار میں جہاد فی سبیل اللہ کے یہ تین نمایاں طور پر الگ اور مستقل میدان ہیں' مکہ مکرمہ میں دار ارقم کی تربیت گاہ اسی افضل الجہاد کی تربیت گاہ تھی جہاں نبوت کی نگرانی و رہنمائی میں تعمیر شخصیات اور سیرت سازئ افراد کا مہتم بالشان کام انجام پایا' دنیا کی تاریخ تحریک اسلامی سے قبل کے مراحل میں اس افضل الجہاد کے تربیتی مرحلہ سے قطعاً ناآشنا اور خاموش نظر آتی ہے اور بعد کی خوشہ چین تحریکات اپنے کارکن تیار کرنے میں نبوی طریق کار کے مقابلہ میں اپنے دیوالیہ پن کا ثبوت پیش کرتی نظر آتی ہیں' ہر میدان اور ہر کام کے اتنے باکمال افراد اتنی کثرت کے ساتھ اور کوئی نہ تیار کر سکا جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی دار ارقم میں اور کبھی مسجد نبوی میں تیار کئے! یہ نظرِ نبوت کا فیضان و اعجاز تھا جس نے اتنے باکمال انسانوں کی جماعت تیار کر لی۔ افضل الجہاد کا یہ مرحلہ درحقیقت وہی مرحلہ ہے جس کے متعلق حکیم الامت مشورہ دیتے ہیں کہ "بانشۂ درویشی درساز و دمادم زن" اسی مرحلہ میں انسانی خودی اپنی پختگی کے مختلف مراحل طے کرتی ہے اور اپنے ظاہر و باطن کو عقیدہ توحید سے فولاد صفت بناتی ہے' تمام معبودان باطل کی نفی کرتے ہوئے "لاموجود فی الکونین الاھو" کا مستانہ نعرۂ توحید بلند کرنے کے قابل ہوتی ہے تو خرمن باطل جلا کر خاکستر کر دیتی ہے۔ راستہ میں آنے والی ہر قوت باطل پاش پاش ہوتی جاتی ہے۔ اس مرحلہ سے گزرنے کے بعد بندۂ مومن عصا کے ساتھ کار کلیمی بھی انجام دیتا ہے اور شہادت حق کو اپنا مطلوب و مقصود ٹھہرا کر کبھی جہاد اکبر کے میدان میں سرگرم نظر آتا ہے اور کبھی جہاد اصغر کے میدان میں قوت باطل سے برسرپیکار نظر آتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کا یہ ارشاد بجا ہے کہ دعوت رجوع الی القرآن کا ایک میدان روحِ جہاد کا احیاء بھی ہے۔ بندۂ مومن کو جہاد بالنفس کی حقیقت سے روشناس کر کے اسے

(باقی ص۶۱ پر)

تحریکِ دعوت الی القرآن

ڈاکٹر محمد یوسف گورایہ

یہ مقالہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے زیرِ اہتمام
سالانہ محاضراتِ قرآنی (مارچ ۱۹۹۰ء)
کے موقع پر پیش کیا گیا

مقصدِ خلق اللہ تعالیٰ نے جن و انس کی تخلیق کا مقصد اپنی عبادت قرار دیا ہے:

"وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ"[1]

"اور میں نے جنوں اور انسانوں کو اس لیے پیدا کیا ہے کہ میری عبادت کریں"۔

دعوت اِلَی اللہ انسان کا مقصودِ حقیقی اللہ ہے۔ دعوت اِلَی اللہ مقصودِ حقیقی کے حصول کا ذریعہ ہے۔ انبیاء و رُسل اس کے داعی رہے ہیں۔ یہی وہ راستہ ہے جس کی طرف دعوت دینے کے لیے سب سے آخری نبی حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے:

"قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۣ عَلٰي بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ ۭ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ"[2]

"کہہ دو میرا رستہ تو یہ ہے میں اللہ کی طرف دعوت دیتا ہوں (از روئے یقین اور برہان) سمجھ بوجھ کر۔ میں بھی (لوگوں کو اللہ کی طرف دعوت دیتا ہوں) اور میرے پیرو بھی اور اللہ پاک ہے۔ اور میں شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں"۔

دعوت اِلَی اللہ کی وجہ سے قرآن نے نبی اکرم صلعم کو داعی اِلَی اللہ کا لقب عطا فرمایا:

"وَدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا"[3]

"اور اللہ کی طرف بُلانے والا اور چراغ روشن"۔

---

[1] قرآن الذّٰریٰت ۵۱ : ۵۶ [2] قرآن یوسف ۱۲ : ۱۰۸
[3] قرآن الاحزاب ۳۳ : ۴۶

جب عبادتِ الٰہی حقیقی مقصدِ حیات ہے تو اس کے مفہوم کی صحیح تعیین اور اس کے معنی اور مطلب کی صحیح تفہیم پر تحقیق اوّل ترجیح قرار پاتی ہے ۔ یہ اصطلاح ایسی تعبیر نو کا تقاضا کرتی ہے جو دورِ جدید میں عقاید، عبادات، اخلاق، ریاستی امور، حکومتی معاملات، معاشرتی، معاشی سیاسی، تہذیبی اور تمدنی اُمور و مسائل میں اللہ کی مرکزیت کو ثابت کر دے ۔

اس اعتبار سے رسمی عبادات اس وسیع اور ہمہ گیر عبادتِ الٰہی کا جز ہیں حکم، حکومت اور ریاست کے جملہ امور، معاشرت، معیشت اور سیاست کے تمام معاملات، انفرادی، اجتماعی، قومی اور بین الاقوامی تعلقات و روابط کے تمام اصول و قواعد کو توحید پر استوار کرنا عبادتِ الٰہی کے مختلف پہلو ہیں :

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ۭ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ۭ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ۭ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ [۴]

"اللہ کے سوا کسی کا حکم نہیں ۔ اس نے حکم دیا کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو یہی سیدھا دین ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے ۔"

پورے معاشرتی اور معاشی نظام کو بدل کر اسے توحید کے اصولوں پر از سر نو قائم کرنا نظام صلوٰۃ ہے ۔ اسی پر قوم شعیبؑ نے تعجب کرتے ہوئے پوچھا تھا :

قَالُوْا يٰشُعَيْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَاۗؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰۗؤُا [۵]

"انہوں نے کہا شعیب ! کیا تمہاری نماز تمہیں یہ سکھاتی ہے کہ جن کو ہمارے باپ دادا پوجتے آئے ہیں ہم ان کو ترک کر دیں یا اپنے مال میں جو تصرّف کرنا چاہیں تو نہ کریں ۔"

تسخیر کائنات، انسانیت کے جملہ معاملات، اور خالق، مخلوق اور کائنات کے تعلقات کے فطری اصول دریافت کرنا اور ان کے مطابق انفرادی اور اجتماعی زندگی گذارنا عبادتِ الٰہی ہے ۔

دعوت الی القرآن عبادتِ الٰہی کے اس وسیع اور ہمہ گیر تصور کو عملی جامہ پہنانے کا فطری اور سائنسی ذریعہ وہ ہدایت ہے جو قرآن میں محفوظ ہے ۔ دورِ حاضر

---

۴ قرآن سورۂ یوسف ۱۲ : ۴۰

۵ قرآن سورۂ ھود ۱۱ : ۸۷

میں دعوت الی القرآن کا مطلب اس فطری اور سائنسی طریقے کی دریافت اور حیات و کائنات کے جملہ امور کو اس پر استوار کرنے کے لیے لائحۂ عمل کی ترتیب ہے۔ جس کے چند اصول یہ ہیں:

۱۔ جدید سائنسی، تکنیکی، حیاتیاتی، نفسیاتی، معاشی اور جمہوری نظریات و تصورات کی عظمت کو مانتے ہوئے ان کے اصول و مبادیات پر تحقیق کرنا اور دیکھنا کہ وہ کس حد تک عبادتِ الٰہی کے قرآنی عقیدہ سے مطابقت رکھتے ہیں اور کس حد تک اس سے متصادم ہیں۔

۲۔ فرد، خاندان، قبیلہ، قوم کے تعلقات اور ریاستی اُمور، حکومتی معاملات، معاشرتی تعلقات کو الٰہیات کے عقاید سے جاری ہونے والی دینی، اخلاقی اور روحانی اقدار پر استوار کرنا تاکہ فرد اور معاشرے کے تعلقات اور فرد، معاشرے اور ریاست کے روابط، عبادتِ الٰہی کے عقیدے سے مربوط ہو جائیں۔

۳۔ عقاید، عبادات اور معاملات کی ایسی تعبیر نو کرنا کہ وہ ایک دوسرے کے معاون و مددگار ہوں اور وہ ایک دوسرے سے متصادم اور مزاحم نہ ہوں۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد میں اس توازن اور تناسب کو اُجاگر کرنا جسے قرآن نے "فطرت اللہ" کہا ہے:

"فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ"[۶]

"اللہ کی فطرت کو جس پر اس نے انسان کو پیدا کیا ہے (اختیار کیے رہو) اللہ کی بنائی ہوئی فطرت میں تبدیلی نہیں ہو سکتی۔"

۴۔ گذشتہ دور کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی نظام کے احیاء اور اس کی نشاۃ ثانیہ کی بجائے اسلام کے فطری، ابدی، سرمدی اور آفاقی اصولوں کو صاف اور کھلے انداز میں پیش کرنا تاکہ ان کی بنیاد پر نیا سیاسی، معاشی اور معاشرتی نظام معرض وجود میں لایا جا سکے۔ نظامِ فطرت خود ارتقاء پذیر ہے۔ کسی دور کا سیاسی نظام کیسے مستقل ہو سکتا ہے؟ ثبات فقط تغیّر کو ہے زمانے میں۔ جس نسبت سے فطرت اور معاشرت ارتقار کرتے ہیں اسی نسبت سے قرآنی اقدار کی بنیاد پر نیا نظام معرض وجود میں آنے کا تقاضا کرتا ہے۔

۵۔ قرآن کی تعلیمات کو پیش کرتے وقت اس اصول کو ملحوظ رکھنا کہ جن قرآنی تعلیمات کی ایک تعبیر ہو چکی ہے ان کی جدید تعبیر ممکن ہے اور جن تعلیمات کی تعبیر زمانہ ماضی میں خارجی تقاضوں کے

---

[۶] قرآن سورۃ الروم ۳۰ : ۳۰

فقدان کی وجہ سے اب تک نہیں ہوئی ان کی تعبیرِ اوّل کا خیر مقدم کرنا اور اس کی حوصلہ شکنی کی بجائے حوصلہ افزائی کرنا دعوت اِلی القرآن ہے۔ قرآن ہر زمانے کے تقاضوں کے لیے ہدایت رکھتا ہے۔ یہ اس زمانے کے لوگوں کا فرض ہے کہ وہ اپنے زمانے کے لیے محفوظ ہدایت کی تلاش کریں۔ گزشتہ ادوار کے رہنماؤں نے اپنے اپنے دور کے تقاضوں کے لیے ہدایت کی تلاش کی تھی۔ دورِ حاضر یا مستقبل کے حالات و تقاضے ان کو درپیش نہ تھے وہ ان پر اپنے افکار کا اظہار کس طرح کرتے؟ قرآن کی تعلیمات غیر متبدل ہیں لیکن مختلف اعصار و امصار میں ان کی تعبیرات متبدل اور متغیّر ہیں۔ شریعت خداداد ہے، وہ غیر متبدل ہے۔ تعبیرِ شریعت انسان ساختہ ہے۔ وہ متبدل ہے۔ یہ بھی دعوت اِلی القرآن ہے کہ ابدی، حتمی، قطعی، اٹل اور غیر متبدل کو وقتی عارضی، متبدل اور متغیر سے علیحدہ کیا جائے اور بدون لومۃ لائم شریعت کو شریعت اور تعبیرِ شریعت کو تعبیرِ شریعت کہا جائے۔

میری نظر میں مندرجہ بالا اصولِ خمسہ دعوت اِلی القرآن کے عمل کو تیز تر کر سکتے ہیں۔

اجتہاد اور دعوت اِلی القرآن

ان اصولوں کی روشنی میں دیکھا جائے تو دعوت اِلی القرآن درحقیقت اجتہاد کا دوسرا نام ہے۔ قرآن چونکہ دائمی ہدایت ہے اس لیے اجتہاد، قرآن پر عمل کا مستقل اصول ہے۔ اصولِ فقہ کا قاعدہ ہے: "تغیّر الاحکام بتغیّر الاحوال" حالات میں تبدیلی سے احکام میں تبدیلی پیدا ہوتی ہے۔ قرآن کے مطابق اللہ نے بنیادی اختیارات عوام کو تفویض کئے ہیں:

وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلَآئِفَ الْاَرْضِ[1]

"وہی تو ہے جس نے تم سب کو زمین میں نائب بنایا"

جن اختیارات کی نیابت عوام کو تفویض ہوئی ان میں تین خاص طور پر اہم ہیں

۱۔ اختیارِ حکمرانی

۲۔ اختیارِ قانون سازی

۳۔ اختیارِ وسائلِ معاش

خلافتِ راشدہ میں عوام ان اختیارات کے مالک تھے پھر حالات میں تبدیلی آئی۔ ملوکیت قائم ہوگئی اور ملوک و سلاطین ان اختیارات پر قابض ہو گئے۔ اور عوام ان سے محروم ہو گئے۔

---

[1] قرآن سورۃ الانعام ۶ : ۱۶۵

اب ان دونوں نظاموں کا موازنہ کیا جائے تو صاف نظر آئے گا کہ دورِ خلافت میں دعوت الی القرآن کا مطلب توحید اور عبادتِ الٰہی کی بنیاد پر شریعت کی ایسی تعبیر کرنا تھا، جس کے تحت تمام حقوق و اختیارات کے مالک عوام ہوں۔ یہ فقہِ خلافت تھی جبکہ دورِ ملوکیت میں دعوت الی القرآن کا مفہوم ایسی فقہ سازی تھا جس کے تحت تمام حقوق و اختیارات کے مالک ملوک و سلاطین ہوں اور عوام سمع و طاعت کے اصول کے تحت محض فرمانبردار اور اطاعت شعار رعایا ہوں۔ یہ فقہ ملوکیت تھی۔ اب دورِ جمہوریت ہے۔ اس میں دعوت الی القرآن کا مطلب یہ ہے کہ قرآنی تعلیمات کی ایسی تعبیر نو ہو جو عوام کو ان کے غصب شدہ حقوق و اختیارات بحال کرے جس طرح دورِ خلافت کی تعبیرِ شریعت دورِ ملوکیت کو راس نہ آئی تھی اور اپنے قیام کے لیے اس نے فقہِ ملوکیت تیار کی تھی بالکل اسی طرح دورِ ملوکیت کی فقہِ ملوکیت دورِ جمہوریت کے لیے ناسازگار ہے۔ دورِ جمہوریت فقہِ جمہوریت کا شدید تقاضا کر رہا ہے، وہ دعوت الی القرآن کامیابی سے ہم کنار ہوگی جو اس تقاضے کے ساتھ ہم آہنگ ہو۔

ڈاکٹر اسرار احمد بطور داعی الی القرآن

عصر حاضر میں دعوت الی القرآن کے داعی میں جو صفات ہونی چاہئیں وہ کافی حد تک پاکستان کے اسلامی مفکر ڈاکٹر اسرار احمد میں موجود ہیں۔

اوّل: خلوص، نیک نیتی اور سنجیدگی بالفاظ قرآن " اِبْتِغَاءَ وَجْهِ اللّٰهِ " ۱۳/۲۲

دوم: " فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا " (۳۰ : ۴۳) کے تتبع میں یک جہتی اور یکسوئی۔

سوم: قرآن کے ساتھ وارفتگی، روحِ اسلام تک رسائی کی شدید تڑپ۔

چہارم: قرآنی تعلیمات پر عمل کا جذبۂ صادق " فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ " (۳ : ۱۵۹)

پنجم: " بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ " کے زیرِ اثر تبلیغ دین کا شدید احساس۔

ششم: زہد، تقویٰ اور صدق کے اوصاف پر پاکیزہ سیرت اور بے داغ کردار

ہفتم: ذاتی، مادی اور وقتی مفادات سے بالا، سستی شہرت، ریاکاری اور نمود و نمائش سے بے نیاز۔

ہشتم: حلال روزی پر قناعت اور کفایت شعاری۔

نہم : شریعت کی تعبیر نو کا احساس وشعور
دہم : متدین اور مخلص طبقہ معاشرت پر دعوت کے مثبت اثرات

دعوت الی القرآن

ڈاکٹر صاحب کی دعوت کا علمی، تاریخی اور فکری تجزیہ ظاہر کرتا ہے کہ انہیں تاریخی عوامل اور ان کی اثر اندازی کا ادراک حاصل ہے۔ فکری ابہام میں مبتلا ہو کر مسلمانوں کے کئی عالی دماغ ٹھوکر کھا چکے ہیں۔ جس چیز کو وہ سنجیدگی کے ساتھ شریعت قرار دیتے رہے ہیں درحقیقت وہ تعبیر شریعت تھی۔ اصل چیز 'CONCEPTUAL CLARITY' ہے۔ جس مفکر نے شریعت اور تعبیر شریعت کے درمیان فرق و امتیاز کا شعور حاصل کر لیا وہ صحیح معنوں میں راہنمائی اور رہبری کے منصب پر خود بخود فائز ہو گیا۔ ڈاکٹر صاحب کی دعوت کا مطالعہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ حقیقت کو پا لینے کے بعد اس کے اظہار کی قوت سے مالا مال ہیں۔ حکمت قرآن شمارہ فروری ۱۹۹۰ء کے صفحہ ۸۴ پر قرآن اور جہاد پر بحث کے دوران انہوں نے ان عوامل کی نشاندہی کی ہے جن کے ذریعے اسلام نے مملکت اور سلطنت کی شکل اختیار کر لی تھی جس کے نتیجے میں فرد و اجتماع کے ظاہر کے لیے قوانین و ضوابط اولویت اور مکارم اخلاق یا مواعظ حسنہ ثانوی حیثیت اختیار کر گئے۔ اس پر ان کا یہ تبصرہ علم افروز ہے "یہی وجہ ہے کہ جب اسلام مملکت اور سلطنت کے دور میں داخل ہوا تو اصل زور ایمان کے بجائے اسلام پر یقین کے بجائے اقرار اور شہادت پر اور باطن سے بڑھ کر ظاہر پر ہو گیا۔ نتیجتاً قرآن حکیم کے بھی منبع ایمان اور سرچشمہ یقین ہونے کی حیثیت مؤخر اور نگاہوں سے اوجھل ہوتی چلی گئی اور کتاب قانون اور یکے از ادلہ اربعہ ہونے کی حیثیت مقدم اور مرکز توجہ بنتی چلی گئی اور پھر جیسے جیسے مملکت اور سلطنت کے تقاضے پھیلتے گئے اور قانون کی عملداری وسیع ہوتی گئی قرآن مجید تو چار میں کے ایک کی حیثیت میں پس منظر میں گم ہوتا چلا گیا اور توجہات حدیث اور فقہ پر مرتکز ہو کر رہ گئیں۔ ستم بالائے ستم یہ کہ علم اور حکمت کے میدان میں جو خلا اس طرح پیدا ہوا اسے پر کرنے کے لیے مصر یونان کی جانب سے فلسفہ و منطق کی آندھیاں آئیں۔ نتیجۃً پورا عالم اسلام ارسطو کی منطق اور نو افلاطونی تصوف کی آماجگاہ بن کر رہ گیا۔ یہاں تک کہ فقہ و اصول اخلاق کے لیے بھی مسلمانوں کو اغیار کے سامنے کاسۂ گدائی پیش کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا! اور رفتہ رفتہ صورت یہ ہو گئی کہ قرآن نہ منبع ایمان رہا نہ سرچشمہ یقین اور نہ مخزن اخلاق رہا نہ معدن حکمت۔ بلکہ صرف ایک ایسی کتاب مقدس بن کر رہ گیا جس کے الفاظ

یا تو حصولِ برکت اور ایصالِ ثواب کا ذریعہ بن سکتے ہیں یا زیادہ سے زیادہ تعویذ گنڈے اور جھاڑ پھونک کے کام آ سکتے ہیں۔"

کسی تحریک کی قوت کا راز اس کے تصوّرات، نظریات اور افکار کی توانائی اور تازگی میں مضمر ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی تحریک ان افکار سے مالا مال ہے۔ برصغیر پاک و ہند میں اسلام پر ان کا تبصرہ بڑا جاندار ہے۔ ایک پاکستانی مسلمان مفکّر کی حیثیت سے ان کی یہ نہایت عالمانہ، محققانہ اور جرأت مندانہ رائے ہے وہ لکھتے ہیں:

"گویا ہندوستان میں اسلام آیا ہی اس وقت جب وہ اپنی نشأۃ اولیٰ کے بعد زوالِ اوّل سے پوری شدّت کے ساتھ دوچار ہو چکا تھا۔ اور اس کی وحدت فکری بھی پارہ پارہ ہو چکی تھی اور وحدتِ ملّی بھی۔ چنانچہ ایک طرف عالم اسلام کے قلب میں عرب قوت کا تقریباً خاتمہ ہو چکا تھا اور خلافتِ بنی عباس کا دیا چراغِ سحری کے مانند ٹمٹما رہا تھا اور پوری مملکت طوائف الملوکی کا شکار تھی۔ گویا بنی اسمٰعیل کے حق میں وعیدِ خداوندی " اِنْ تَتَوَلَّوْا یَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَکُمْ " پوری طرح ظاہر ہو چکی تھی ـــــ اور دوسری طرف خلافتِ اسلامی کی وہ توحیدی شان ایک داستانِ پارینہ بن چکی تھی جس میں نہ دین و دنیا کے مابین کوئی دوئی تھی نہ مذہب و ریاست میں کوئی جدائی اور خدا کے جلال و جمال کے مظاہر جدا تھے نہ سلطانی و درویشی کے مصداق مختلف! ـــــ اور اس کی جگہ قیادت و سیادت اور رہنمائی و پیشوائی کے ضمن میں ملوک، احبار اور رہبان پر مشتمل وہ قدیم تثلیث پوری طرح رائج و نافذ ہو چکی تھی جو ایک اسلام کے سوا دنیا کی تمام تہذیبوں اور تمدّنوں کا جزوِ لاینفک رہی ہے اور جس سے پیشگی خبردار کیا تھا عہدِ اوّلین ہی میں حضرت عبداللہ ابن المبارکؒ نے اپنے اس حد درجہ فصیح و بلیغ شعر میں ؎

وَمَا اَفْسَدَ الدِّیْنَ اِلَّا الْمُلُوْکُ
وَ اَحْبَارُ سُوْءٍ وَ رُھْبَانُھَا

اس شعر کی اتنی ہی فصیح و بلیغ ترجمانی علامہ اقبال نے اپنے اس شعر میں کی ہے ؎

باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری
اے کشتۂ سلطانی و ملّائی و پیری"

ملوکیت نے کس طرح دین کو بگاڑا اس پر آیت " اِنَّ الْمُلُوْکَ " کی تفسیر میں علامہ اقبال کے مندرجہ ذیل اشعار پیش کیے گئے ہیں:

آ بتاؤں تجھ کو رمزِ آیۂ اِنَّ المُلُوکْ — سلطنت اقوامِ غالب کی ہے اک جادوگری
خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر — پھر سُلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری
جادوئے محمود کی تاثیر سے چشمِ ایاز — دیکھتی ہے حلقۂ گردن میں سازِ دلبری
سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے — حکمراں ہے اِک وہی باقی بتانِ آزری!"

مدرسہ و خانقاہ کی منافرت پر نہایت بصیرت افروز بحث کی گئی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

" ہندوستان میں اسلام علاقہ ماوراء النہر سے آیا تھا جہاں خود مذہبی حلقوں میں مدرسہ و خانقاہ کی تقسیم راسخ ہو چکی تھی اور ان کے مابین مسابقت ہی نہیں منافرت کا آغاز ہو چکا تھا اور جہاں مدارس میں حنفی فقہ، اشعری و ماتریدی عقائد، یونانی فلسفہ و منطق اور ان سب کے معجون مرکب علم کلام کا دور دورہ تھا، اور خانقاہوں میں وحدت الوجود کا سکّہ رواں تھا۔ لہٰذا اسلامی ہند میں مذہب کی عمارت انہی دو ستونوں پر استوار ہوئی یعنی ایک شدید حنفیت اور دوسرے وجودی تصوّف۔"

یہاں انہوں نے غُلوّ فی الحنفیت اور بُعد عن حدیث الرسول پر قابلِ قدر تحقیق پیش کی ہے جسے خواجہ نظام الدین اولیاء اور شیخ الاسلام قاضی جلال الدین کے مابین مناظرہ کی مثال سے متحقق کیا گیا ہے۔

انہوں نے اپنی بحث کا نتیجہ فکر اس طرح پیش کیا ہے:

" اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ اسلامی ہند میں آغاز ہی سے دو حکومتیں قائم ہو گئی تھیں۔ ایک ظاہری حکومت جس کا اقتدار یا زمین پر قائم تھا یا انسانوں کے جسموں پر، اور دوسری باطنی حکومت جس کا سکّہ قلوب کی دنیا میں رواں تھا۔ پہلی حکومت اصلاً ملوک و سلاطین اور امراء و عمائدِ سلطنت کی تھی اور ان کے ساتھ بطور تتمّہ یا ضمیمہ منسلک تھے ائمہ و خطباء، مدرسین و معلمین اور مفتی و قاضی حضرات، اور اس دنیا میں جیسے کہ عرض کیا گیا فقہ ہی کو گویا کل دین کی حیثیت حاصل تھی جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ متشددانہ ظاہر پرستی اور قانونی موشگافی کا دور دورہ ہو گیا اور رفتہ رفتہ دین و مذہب نے بالکل خشک قانونیت کی شکل اختیار کر لی۔" حکمتِ قرآن کے زیرِ تبصرہ شمارہ میں ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے جن تاریخی مباحث کو پیش کیا ہے وہ تحقیقی اور تخلیقی ہیں۔ قیامِ پاکستان کے بعد وہ پہلے متدیّن عالم ہیں جنہوں نے حقائق کا سخت محنت سے کھوج لگایا ہے اور پوری جرأتِ ایمانی کے ساتھ انہیں پیش کیا ہے۔

دورِ مملوکیت میں فقہ و فتاوٰی کیسے مرتّب ہوئے، اس کی حقیقت ایک جید عالم اور فقیہہ کی شہادت سے پیش کرتے ہیں :

فتاوٰی جہانداری

کتبِ فتاوٰی کیسے مرتّب ہوئیں! برِصغیر پاک و ہند کے ماحول کے پس منظر میں اس کی مکمل ترین تشریح جیّد عالم، نامور مؤرخ اور ممتاز محقق ضیاء الدین برنی کی "فتاوٰی جہانداری" میں ملتی ہے۔ فتاوٰی جہانداری فیروز شاہ تغلق کی حکومت کے پہلے چھ برسوں میں مرتّب ہوئی تھی۔ فتاوٰی کی اس کتاب کے اہم اور بنیادی نکات یہ ہیں :

"برنی نے رسولِ خدا اور خلفاء کی روایات اور معمولات کو یہ کہہ کر بر طرف کر دیا ہے کہ یہ اصول ایک ایسے دور کی یادگار ہیں جو محض وقتی تھی اور جس کا دوبارہ ظہور میں لانا اس لیے ناممکن ہے کیونکہ وہ ایک مثالی چیز تھی اور تبدیل شدہ حالات میں اس کے حصول کی کوشش بے سود ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر خدا کی طرف سے وحی آتی تھی اور خلفائے راشدین کو انہوں نے تربیت دی تھی۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جو واقعات گذر گئے ہیں ان کی تکرار ناممکن ہے۔ جہاں داری چونکہ حکمران طبقہ کا حق ہے اس لیے سماجی نظام کو وراثت کے ذریعے برقرار رکھنا ضروری ہے جہاں تک مسلمان عوام کا تعلق ہے ان کی جگہ معیّن ہے۔ علماء کے لیے ازبس ضروری ہے کہ وہ عوام کو دینی رسوم مثلاً نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کی ادائیگی سے ماوراء کوئی تعلیم نہ دیں۔ رہے وہ لوگ جو محکوم ہیں اور اسلام قبول کر چکے ہیں مثلاً ہندو اور منگول ان کی طرف توجہ کی چنداں ضرورت اس لیے نہیں ہے کیونکہ توحید کا تصوّر جسمانی طور پر انہیں ورثہ میں نہیں ملا ہے اور نہ اس قسم کا کوئی عقیدہ ان کے خون میں جاری و ساری ہے۔ آگے چل کر برنی کہتا ہے نہ تو ہم میں وہ مسلمان باقی ہے اور نہ ہمیں وہ مسلمان میسّر ہیں جن پر ہم ابوبکرؓ و عمرؓ کی طرح حکومت کر سکیں۔ اپنی دلیل کو مستحکم کرنے کے لیے برنی کہتا ہے کہ ہم اس واقعہ کو نظر انداز نہ کریں کہ چار خلفاء میں سے جنہوں نے رسول کے بتائے رستہ پر چلنے کی کوشش کی تین کو صرف اس لیے شہید کر دیا گیا کیونکہ وہ حکمرانوں کی طرح اپنا ذاتی تحفظ غیر ضروری سمجھتے تھے"۔[1]

---

[1] خلیق احمد نظامی، تاریخ مشائخ چشت، تعارف از محمد حبیب صدر شعبۂ سیاسیات مسلم یونیورسٹی علیگڑھ، ۱۹۵۲ء صفحات ۲۲، ۲۴

ڈاکٹر صاحب کے ان افکارِ عالیہ کے مطالعے کے بعد ان سے گذارش کی جاسکتی ہے کہ دعوت الی القرآن کی جس عظیم تحریک کے وہ علمبردار ہیں اس کا تقاضا ہے کہ گذشتہ تفاسیر کی ظاہریت پر قناعت نہ کی جائے۔ تفاسیر اور روایات بھی فقہی احکام و قوانین کی طرح ملوکیت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہی تھیں۔ قرآن کی ہر آیت اور قولِ رسولؐ کی ہر حدیث پر ان کے غلاف موجود ہیں۔

اس عرضداشت پر اپنی بات ختم کرتا ہوں کہ جو متفکر عقاید و عبادات کو انسانی حقوق، اختیارات اور معاملات کے ساتھ مربوط کر کے پیش کرتا ہے۔ اس کی تحریک کو خلق خدا کی دعائیں تیز تر کر دیتی ہیں۔ عوام کے اخلاق اور ان کے حقوق و اختیارات کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ حضورؐ کا اسوۂ حسنہ یہ ہے کہ آپ نے ایمانیات اور معاشی، سماجی اور سیاسی حقوق کو مربوط کر کے پیش کیا تھا۔ توحید کی وضاحت اخوت، مساوات، حریت اور جمہوریت کی اصطلاحات سے کی تھی۔ جو عام بدو کو بھی سمجھ میں آگئی تھی۔ رزق کے وسائل کو خالق کی طرف سے مخلوق کے لیے مساوی طور پر بیان کیا تھا۔ دورِ حاضر میں اب ان عقائد کو زیادہ آسانی کے ساتھ بہت جلد عام کیا جاسکتا ہے کیونکہ اب عوام خود بیدار اور باشعور ہیں۔ اُس وقت انہیں بیدار بھی کرنا پڑتا تھا اور انہیں حقوق کا شعور بھی دلانا پڑتا تھا۔ ہر دور میں دعوت کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں۔ ایک دور کا طریق دعوت اپنے دور کے تہذیبی، سماجی، نفسیاتی اور تمدنی حالات کے مطابق ہوتا ہے۔ میری رائے میں دعوت الی القرآن کی تحریک کو اس وقت پر لگ جاتے ہیں جب اللہ کے عطا کردہ حقوق کے حوالے سے ایمانیات، عقاید اور عبادات کو پیش کیا جائے، اور عوام " یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا " کے مصداق فوج در فوج دین کے غلبے کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ انسانی حقوق، آئینی ریاست، قانون کی حکمرانی، شہری آزادیاں عقاید کو متحرک اور فعال بنا دیتی ہیں وہ ان کے بغیر جمود، تعطل اور تقلید کا شکار ہو کر رہ جاتے ہیں۔

میں آخر پہ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کو اس عظیم شاہکار کی تخلیق پر دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں، اور ان کی خدمت میں ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہوں کہ انہوں نے بر وقت قوم کی رہنمائی کا فریضہ انجام دیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ وہ اپنی دعوت الی القرآن کو بنیادی انسانی حقوق، شہری آزادیوں، قانون کی حکمرانی اور آئینی اور قانونی ریاست و حکومت کے اسلامی تصورات کے ساتھ مربوط کر کے اس تحریک کے فیوض، برکات اور ثمرات کو عوام الناس تک عام کرنے کی جد و جہد کو تیز تر فرمائینگے۔

دعوت اِلیٰ القرآن — چند تأثرات

چوہدری مظفر حسین

یہ مقالہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے زیرِ اہتمام
محاضراتِ قرآنی (مارچ ۹۰ء)
کے موقع پر پیش کیا گیا

میں محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے حسب معمول اس سال بھی محاضرات قرآنی میں مجھے مدعو کیا۔ یہ ان کی وضع داری اور ذرہ نوازی ہے کہ ایسے مواقع پر ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم و مغفور سے ارادت مندی کے حوالے سے مجھے یاد فرماتے ہیں۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ راقم اپنی علمی فرومایگی کے باعث ایسی علمی مجالس میں باریابی کا اہل نہیں۔ یہ محض ان کا الطاف خسروانہ ہے کہ اس ہیچمدان کو بھی وہ ان مجالس میں طلب فرمالیتے ہیں۔

گزشتہ سالوں کے محاضرات سے اس سال کے محاضرات اس اعتبار سے مختلف ہیں کہ اس میں ارتکازِ مباحث خود ڈاکٹر صاحب کی ایک تالیف کے مندرجات اور مشمولات پر ہے جن کا موضوع خطۂ برصغیر پاک و ہند میں دعوت رجوع الی القرآن کی تاریخ ہے۔ موجودہ محاضرات کی حیثیت چونکہ ایک طرح سے اس کتاب کی تقریب رونمائی کی سی ہے۔ اس لئے میرے لئے مشکل پیدا ہو گئی ہے کیونکہ میں اِدھر اُدھر کی گپ شپ لگا کر کام چلانے کا عادی ہوں۔ لیکن موجودہ صورت میں تو جو بھی معروضات پیش کی جائیں گی انہیں تبصرۂ کتاب پر محمول کیا جائے گا۔ تبصرہ نگاری ایک مشکل کام ہے۔ لیکن ہمارے ہاں تبصرہ نگاری کی مروجہ شکلوں میں سے ایک آسان شکل یہ بھی ہے کہ تاثراتی بیان و اسلوب سے بھی کام چل جاتا ہے۔ اسی آسانی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے میں یہاں محض اپنے تاثرات بیان کرنے پر اکتفا کروں گا۔

ڈاکٹر صاحب سے میری یک طرفہ شناسائی کالج کے زمانے میں ہوئی جن دنوں آپ نے کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج میں ایم۔بی۔بی۔ایس کے سال اول میں داخلہ لیا۔

میں بھی بی-ایس-سی کے طالب علم کی حیثیت سے اس کالج میں اناٹومی اور فزیالوجی کے مضامین کا طالب علم تھا اور میرا کورس قریب الاختتام تھا- مجھے یاد ہے کہ ایک نووارد کی حیثیت سے ڈاکٹر صاحب کی شہرت ایک نہایت ذہین اور ہونہار طالب علم کی تھی، جس میں ہمارے لئے خوشی کی بات یہ تھی کہ یہ اسلامی جمعیت طلبہ کے بھی رکن تھے- میں ان سے پوری طرح متعارف بھی نہیں ہو پایا تھا کہ بی-ایس-سی کے امتحان سے فارغ ہو گیا- لیکن بعد میں اولاً جمعیت اور بعدہٗ جماعت کے رکن کی حیثیت سے ان کا غائبانہ ذکر دورانِ ملازمت بھی سنتا رہا- ماچھی گوٹھ کا دھماکہ خیز اجتماع جماعت کے ہر رکن اور ہمدرد کے لئے ایک بہت بڑا صدمہ تھا اور اس کے نتیجے میں جن اراکین نے جماعت سے علیحدگی اختیار کی ان میں ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کا بھی نام سنا گیا-

بعد میں جماعت چھوڑنے والے تمام لوگوں میں سے ڈاکٹر صاحب موصوف جماعت اسلامی کے شدید ترین نقّاد کی حیثیت سے ابھرے- اس طرح ان کا اپنا تشخص تو نمایاں سے نمایاں تر ہوتا گیا لیکن جماعت اسلامی ایک اعلیٰ قائدانہ صلاحیت رکھنے والے رکن سے محروم ہو گئی- راقم آج بھی کھلے عام اپنی اس کم فہمی کا اعتراف کرتا ہے کہ وہ ڈاکٹر صاحب کی تحریروں کو پڑھنے کے باوجود اختلافات کی اس گہرائی تک کبھی رسائی حاصل نہیں کر سکا جس نے شخصیات کے ٹکراؤ کی ایسی صورت پیدا کی کہ اکابرین جماعت ایک دوسرے سے بیزار ہو گئے- راقم آج بھی دیانت داری سے یہی سمجھتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب موصوف نے جماعت اسلامی کی تنظیم اور مولانا مودودی کی شخصیت کو وقتاً فوقتاً نشانۂ تنقید بنا کر کوئی مفید خدمت انجام نہیں دی- البتہ جماعت سے ان کی علیحدگی کا ایک مثبت نتیجہ یہ ضرور نکلا کہ ڈاکٹر صاحب کچھ عرصے کے لئے سیاسی سرگرمیوں سے کٹ کر ہمہ تن قرآن حکیم کے مطالعہ میں مستغرق ہو گئے اور تعلّم و تعلیمِ قرآن کے سلسلے میں ایک نہایت شاندار کارنامہ انجام دیا- ڈاکٹر صاحب موصوف کا کوئی کٹّر سے کٹّر مخالف بھی ان کی ان خدمات سے انکار نہیں کر سکتا- خود ڈاکٹر صاحب اپنے اس کارنامہ سے اس حد تک مطمئن ہیں کہ ان میں نفسِ مطمئنّہ کی ایک پیشگی جھلک محسوس ہوتی ہے- فرماتے ہیں:

"عالمِ آخرت سے قریب تر اور عالمِ دنیا سے ذہناً اور قلباً بعید اور منقطع محسوس کرتا ہوں- جب کبھی تنہائی میں اپنی گزشتہ زندگی خصوصاً اس

کے چالیس سالہ شعوری دور پر نگاہ ڈالتا ہوں تو اولاً تو نہ صرف یہ کہ اپنے باطن میں نہایت گہرے سکون اور اطمینان کا احساس ہوتا ہے کہ ع "جنوں میں جتنی بھی گزری بکار گزری ہے"۔ بلکہ قلب و روح کی سر زمین پر ایک جانفزا فرحت اور مسرت آمیز انبساط کی تسکین بخش پھوار سی محسوس ہوتی ہے کہ ع

شادم از زندگیٔ خویش کہ کارے کردم "

اگر کوئی صاحبِ ایمان جیتے جی اپنی زندگی سے اس حد تک مطمئن ہو تو اس سے زیادہ خوش نصیبی اور کیا ہو سکتی ہے۔ اپنا تو یہ حال ہے کہ جب راقم نے یہ سطور پڑھیں تو پیمانۂ دل جذبۂ رشک سے چھلک چھلک گیا۔ آنکھیں نمناک ہوئیں اور ایک آہِ سوز ناک دل سے اٹھی واحسرتا میرے بھی نامۂ اعمال میں کوئی ایسی بات ہوتی۔

ڈاکٹر صاحب موصوف کی تحریر کا یہ منفرد اسلوب ہے کہ اپنی قبائے تحریر میں تاریخ و حکمت کے ساتھ ساتھ اپنی سرگزشت بھی تارِ حریرِ دو رنگ کی طرح بُنتے چلے جاتے ہیں۔ چنانچہ وہ جب بعض شخصیات کا ذکر کرتے ہیں تو ان سے وابستہ تلخ یادوں کو دہرائے بغیر نہیں رہ سکتے۔ جن کی وجہ سے ان کی زبانِ قلم کا ذائقہ کہیں کہیں کڑوا ہو جاتا ہے۔ اگرچہ یہ مصنف کی اپنی صوابدید پر منحصر ہے کہ وہ کس بات کو کتنی اہمیت دیتا ہے اور وہ اسے ضبطِ تحریر میں لانا کس حد تک ضروری یا ناگزیر خیال کرتا ہے۔ لیکن ایک قاری کی حیثیت سے اگر مجھے اپنا تاثر بیان کرنے کا حق دیا جائے تو میں یہ ضرور کہوں گا کہ اس تصنیف میں ایسی باتوں کو بیچ میں نہ ہی لایا جاتا تو بہتر تھا۔ اے کاش! فصل کی بجائے وصل کی روش کو اپنایا جاتا۔ اختلافات کی باتیں ایک بار جب ضبطِ تحریر میں آجاتی ہیں تو مستقبل میں بھی وصل کے امکانات معدوم ہو جاتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب سے میرے تعلقات ڈاکٹر محمد رفیع الدین کی وساطت سے بڑھے اور وہ بھی ڈاکٹر رفیع الدین کی زندگی میں کم اور ان کی وفات کے بعد زیادہ۔ جن دنوں ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم لاہور میں تھے ڈاکٹر اسرار احمد اور راقم سے ان کی اکثر ملاقاتیں رہتیں اور ڈاکٹر اسرار صاحب کا ذکر وہ بڑی محبت سے کرتے۔ ڈاکٹر رفیع الدین کی وفات کے بعد شرکتِ غم سے ڈاکٹر اسرار صاحب سے میری الفت اور محکم ہو گئی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ وہ اپنے حلقہ ہائے دروسِ قرآن میں پوری

طرح منہمک تھے اور ان کے درس قرآن کی دھوم مچی ہوئی تھی- مسجد خضراء میں ان کا درس سننے کے لئے دور دور سے لوگ آتے جو ہر اتوار کو ہوتا تھا- مسجد خضراء کے علاوہ بھی مختلف مقامات پر وہ درس دیتے تھے- بلکہ جہاں جہاں سے بھی دعوت ملتی بلا حیل و حجت وہاں تشریف لے جاتے- چند درس انہوں نے آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کے دفتر میں بھی دیئے- اس دوران مختلف مقامات پر دوسرے علماء کے بھی درس ہوتے لیکن حقیقت یہ ہے کہ جو مقبولیت ڈاکٹر اسرار صاحب کو حاصل ہوئی وہ کسی اور کے حصہ میں نہ آئی-

قرآن حکیم سے امت مسلمہ کی مہجوری کے اسباب چند تاریخی عوامل ہیں جن کی نشان دہی انہوں نے بڑے ہی فکر انگیز لیکن سادہ بیان میں کی ہے- وہ فرماتے ہیں :

"جب اسلام مملکت اور سلطنت کے دور میں داخل ہوا تو اصل زور ایمان کی بجائے اسلام پر، یقین کی بجائے اقرار اور شہادت پر اور باطن سے بڑھ کر ظاہر پر ہو گیا- نتیجتہً قرآن حکیم کے بھی منبع ایمان اور سرچشمۂ یقین ہونے کی حیثیت مؤخر اور نگاہوں سے اوجھل ہوتی چلی گئی اور کتابِ قانون اور یکے از ادلّۂ اربعہ ہونے کی حیثیت مقدم اور مرکزِ توجہ بنتی چلی گئی اور پھر جیسے جیسے مملکت اور سلطنت کے تقاضے پھیلتے گئے اور قانون کی عمل داری وسیع ہوتی گئی، قرآن مجید چار میں سے ایک کی حیثیت سے پس منظر میں گم ہوتا چلا گیا اور توجہات حدیث اور فقہ پر مرتکز ہو کر رہ گئیں- ستم بالائے ستم یہ کہ علم و حکمت کے میدان میں اس طرح جو خلاء پیدا ہوا اسے پُر کرنے کے لئے مصر و یونان کی جانب سے فلسفہ و منطق کی آندھیاں آئیں- نتیجتہً پورا عالم اسلام ارسطو کی منطق اور نو افلاطونی تصوف کی آماجگاہ بن کر رہ گیا- یہاں تک کہ فلسفہ و اصولِ اخلاق کے لئے مسلمانوں کو اغیار کے سامنے کاسۂ گدائی پیش کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا اور رفتہ رفتہ صورت یہ ہو گئی کہ قرآن نہ منبع ایمان رہا، نہ سرچشمۂ یقین، نہ مخزنِ اخلاق اور نہ معدنِ حکمت-"

لیکن دور حاضر میں امت مسلمہ کی قرآن حکیم سے مہجوری کا سبب وہ "تعبیر

کی غلطی" کو ٹھہراتے ہیں جسے وہ احیائے اسلام کی تحریکوں کی سوچ اور طریق کار پر فکر مغرب کے غلبے یا اثرات کا نتیجہ قرار دیتے ہیں- یہی غلطی بالآخر تصورِ دین کی اس خامی اور مطالعۂ دین کے نقص پر منتج ہوتی ہے- تصورِ دین کی اس خامی کے تحت دین اسٹیٹ کا ہم معنی قرار پاتا ہے- عبادت اطاعت کا مترادف ہو کر رہ جاتی ہے- صلوٰۃ معاشرے کی اصلاح و تنظیم، زکوٰۃ معیشت کا ستون، روزہ ضبطِ نفس کی مشق اور حج ایک عالمگیر برادری کے احساس کی شکل-" یہ نئی تعبیر براہ راست نتیجہ ہے مغرب کے فلسفہ و فکر کے ہمہ گیر تسلّط کا جس نے نقطۂ نظر کو ملحدانہ اور مادہ پرستانہ بنا دیا ہے- اور اس کے نتیجہ میں روح اور حیاتِ باطنی خارج از بحث ہو گئی اور اسلام محض ایک سیاسی و عمرانی نظام بن کر رہ گیا-"

یہ نتائجِ فکر تصوف و روحانیت کی طرف ان کے واضح جھکاؤ کا پتہ دیتے ہیں- جس کی پر زور توثیق ان کی مندرجہ ذیل تحریر سے ہوتی ہے :

"عوام کی کشتِ قلوب میں ایمان کی تخم ریزی اور آبیاری کا مؤثر ذریعہ ایسے اصحابِ علم و عمل کی صحبت ہے جن کے قلوب و اذہان معرفتِ ربّانی اور نورِ ایمانی سے منوّر، سینے کبر، حسد، بغض اور ریا سے پاک، زندگیاں حرص، طمع، لالچ اور حُبِّ دنیا سے خالی نظر آئیں- خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کے نظام کے درہم برہم ہو جانے کے بعد ایسے ہی نفوسِ قدسیہ کی تبلیغ و نصیحت اور تربیت و صحبت کے ذریعے ایمان کی روشنی پھیلتی رہی ہے- اور جب سے مغرب کی الحاد و مادہ پرستی کے زہر سے مسموم ہواؤں کا زور ہوا، ایمان و یقین کے یہ بازار بھی بہت حد تک سرد پڑ گئے تاہم ایسی شخصیتیں ابھی بالکل ناپید نہیں ہوئیں جن کے دل روشن، نورِ یقین اور نفس گرم حرارتِ ایمانی سے معمور ہیں اور اب ضرورت اس بات کی ہے کہ ایمان و یقین کی ایک عام رو ایسی چلے کہ قریہ قریہ اور بستی بستی ایسے صاحبِ عزیمت لوگ موجود ہوں جن کی زندگیوں کا مقصدِ وحید خدا کی رضاجوئی اور اس کی خوشنودی کا حصول ہو-"

ایسی تمام تحریریں تصوف کی طرف ان کے قوی رجحان کو ظاہر کرتی ہیں-

لیکن مکاتیب تصوف میں جس مکتب کے لئے ان کے دل میں کشش پیدا ہوئی وہ تبلیغی جماعت ہے - جسے تصوف کی عام اصطلاح میں سلسلہ ہی شمار نہیں کیا جاتا- لیکن اس سلسلے سے بھی وہ اپنے آپ کو پوری طرح ہم آہنگ نہیں پاتے اور اس میں انہیں خامی یہ نظر آتی ہے کہ اس میں اصل تخاطب عقل سے نہیں جذبات سے ہے - اس لئے اس کے اثرات صرف معاشرے کے اس طبقے تک محدود ہیں جن کے یہاں جذبات پر عقل اور علم پر عمل کو اولیت حاصل ہے - جبکہ غلبہ دین کے کام میں معاشرے کی اس ذہین اقلیت کو سب سے زیادہ متاثر کرنے کی ضرورت ہے جو از خود معاشرے کی رہنمائی کے منصب پر فائز اور اجتماعیت کی پوری باگ ڈور پر قابض ہوتے ہیں-

علامہ اقبال نے بھی تصوف کے مروّجہ سلاسل کو قرونِ وسطیٰ کی پیداوار قرار دیا تھا- جس نے اسلامی تفکر کی اصل روح کو کچل کر مسلمانوں کا رخ باطنی واردات پر مرتکز کر دیا چنانچہ ذہین لوگ تصوف کی طرف مائل ہو گئے اور کاروبار سلطنت ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں آیا جو ادنیٰ درجے کی صلاحیتوں کے مالک تھے - علامہ اقبال کے نزدیک اسلام اب چونکہ جدید تفکر اور تجربہ کے دور میں داخل ہو چکا ہے، اس لئے اب کوئی ولی اور پیغمبر بھی اس کا رخ قرونِ وسطیٰ کے تصوف کی تاریکیوں کی طرف نہیں موڑ سکتا-

علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ موجودہ دور کا انسان "محسوسات پر مبنی تفکر" (Concrete Thought) کا عادی ہو چکا ہے اور اسے اب ایک ایسی قسم کا تصوف درکار ہے جو عشق و عقل کی آمیزش سے معرض وجود میں آئے - علامہ کے نزدیک جنوں کی قبا قامتِ خرد کے لئے بالکل موزوں ہے اور وہ رسم فرزانگی کو ذوقِ جنوں بخش سکتی ہے - ڈاکٹر اسرار احمد صاحب بھی اس قسم کا "رسوخ فی العلم" پیدا کرنے کے متمنی ہیں جو تقویٰ اور خشیتِ الٰہی پر منتج ہو - یہی ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم و مغفور کی تمنا اور آرزو تھی - جس کے لئے انہوں نے آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگرس کی داغ بیل ڈالی اور یہی کرنے کا وہ اصل کام ہے جس کے لئے ڈاکٹر اسرار صاحب نے قرآن اکیڈمی کی بنیاد رکھی - "ایک جدید علم الکلام کی تاسیس"، "ایک نئی تہافت کی تصنیف" اور قرآن حکیم کی روشنی میں "جدید فلسفیانہ رجحانات پر مدلل تنقید" سبھی

نہایت ہی مبارک کام ہیں لیکن دکھ کی بات یہ ہے کہ ایسے کاموں کے لئے امت مسلمہ کو کبھی کبھار اکا دکا شخصیات تو میسر آتی رہی ہیں لیکن ایسے مہتم بالشان کاموں کے لئے مستقل ادارے کبھی معرض وجود میں نہیں لائے جاسکے اور اگر کبھی قائم بھی ہوئے تو وہ زیادہ دیر چل نہ سکے - علامہ اقبال مطالعہ قرآن کے اصولوں پر اپنی کتاب لکھنے کی آرزو دل ہی دل میں لئے اس دنیا سے رخصت ہوگئے اور امت مسلمہ کی حیاتِ مستقبلہ کے مسائل پر تحقیق و تدقیق کا وہ منصوبہ جو ان کی وفات کے بعد دارالاسلام کے نام سے مولانا مودودی کے زیر سایہ منصّہ شہود پر آیا' سے لے کر ڈاکٹر اسماعیل الفاروقی کے ادارہ انٹر نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک تھاٹ تک معاملہ نتائج کے اعتبار سے ایک سا ہی رہا ہے - تاہم ہماری دعا ہے کہ قرآن اکیڈمی کا منصوبہ کامیابی سے پروان چڑھے اور خوب پھلے پھولے - آمین -

ڈاکٹر صاحب نے اپنی دعوت الی القرآن کے ضمن میں بعض سلاسل کے ذکر کے ساتھ ساتھ ایک شخصیت پروفیسر یوسف سلیم چشتی کا ذکر بھی کیا ہے لیکن وہ ڈاکٹر برھان احمد فاروقی کو بالکل نظر انداز کر گئے ہیں جو پروفیسر یوسف سلیم چشتی صاحب سے کہیں زیادہ اس بات کے مستحق تھے کہ ان کا ذکر کیا جاتا - جنہوں نے 'منہاج القرآن' جیسی وقیع کتاب تصنیف کی ہے - اس کتاب سے دور جدید کے انسان کے لئے قرآن فہمی کی نئی راہیں کھلتی نظر آتی ہیں - اس کتاب میں مطالعہ قرآن کا ایک منہاج اور قرآنی طریقہ انقلاب کی تکنیک کا بیان بھی ملتا ہے - مگر حیرت ہے کہ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے اپنی پوری کتاب میں ڈاکٹر صاحب کی اس تصنیف کا کہیں ذکر تک نہیں کیا - حالانکہ "مولوی عبداللہ چکڑالوی کی چکڑالویت' محمد علی لاہوری کی لاہوریت' علامہ عنایت اللہ خاں المشرقی کی مشرقیت اور چودھری غلام احمد پرویز کی پرویزیت تک" ان کے شمار میں ہیں - مانا کہ ڈاکٹر برھان احمد فاروقی کے فکر کی شاخ کسی معروف شجرِ شخصیت سے نہیں پھوٹی - مانا کہ ڈاکٹر صاحب کا اسلوبِ بیان فلسفیانہ اور زبان دقیق ہے - پھر بھی ڈاکٹر صاحب کی اس کتاب میں ایسے بصیرت افروز نکتے ملتے ہیں جو گہرے غور و فکر کے متقاضی ہیں - وائے ناقدریٔ زمانہ کہ بقول کالم نویس عطاء الحق قاسمی ڈاکٹر برھان احمد فاروقی وہ غریبِ شہر ہیں جو شہرِ علم میں اپنے علم کی

صلیب اپنے کندھوں پر اٹھائے پھرتے ہیں جبکہ ان کا علمی مقام یہ ہے کہ نصف صدی پیشتر مجدد الف ثانی کے نظریۂ توحید پر لکھا ہوا ان کا مقالہ آج بھی بین الاقوامی طور پر فلسفہ مذہب پر حوالے کی بنیادی کتابوں میں شمار ہوتا ہے۔

اپنی تصنیف منہاج القرآن میں ڈاکٹر برھان احمد فاروقی صاحب نے دعوت الی القرآن ہی کے ضمن میں چند سوالات ایسے اٹھائے ہیں جن سے صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا۔ ان میں سے سب سے بڑا سوال تو یہ ہے کہ خود مسلمان قرآن حکیم کی عطا کردہ ہدایت کی نتیجہ خیزی کے اعتماد سے کیوں محروم ہوتے جا رہے ہیں؟۔ کیا محض اس لئے قرآن مجید کا رشتہ جدید علوم سے کٹ گیا' مگر ان کا دوسرا بڑا سوال یہ ہے کہ علم بالوحی اور انسانی استعداد کے زائیدہ علوم کی ثنویت کے شعور کو برقرار رکھنے کے وہ کیا تقاضے ہیں جو ہر شارح قرآن کو اپنے سامنے رکھنے چاہئیں۔

میں نے جو گزارشات پیش کی ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ دورِ حاضر میں دعوت الی القرآن اور غلبۂ اسلام کے لئے ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے جس مہتم بالشان کام کا بیڑا اٹھایا ہے اس کا تقاضا ہے کہ اس قسم کا کام کرنے والے دوسرے لوگوں سے فصل کی بجائے وصل کی راہیں تلاش کی جائیں۔ جس طرح سائنس دان حضرات اپنے اپنے موقف پر قائم رہتے ہوئے بھی ایک دوسرے کے نقطہ نظر کو احترام کے ساتھ برداشت کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں اور آپس میں اختلافات رکھنے کی بنیاد پر ایک دوسرے سے کٹ کر نہیں رہ جاتے اور علم کی ترقی میں باہم کوشاں رہتے ہیں' کچھ اسی قسم کا رویہ ہم قرآن حکیم کی تشریح میں نہیں اپنا سکتے؟ میں یہ بات بالخصوص ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں اس لئے گوش گزار کرنا چاہتا ہوں کہ ان کے اندر اس قسم کی برداشت کا حوصلہ موجود ہے۔ محاضرات قرآنی میں ہر سال وہ مختلف مکاتیبِ فکر کے لوگوں کو بلاتے اور اپنا اپنا نقطہ نظر بیان کرنے کی دعوت دیتے ہیں اور اس بات کا عام لوگوں نے بہت ہی اچھا اثر لیا ہے۔ ان کی اسی رواداری کے پیش نظر میں نے یہ جسارت کی ہے کہ ان کی کتاب دعوت رجوع الی القرآن میں جن حضرات کا ذکر نہیں آیا اس پر انہیں متوجہ کرا دوں تاکہ تعلیمات قرآن کے ذریعے غلبۂ دین یا اقامتِ دین کے بارے میں ان شخصیات کے نظریات کی جانچ پرکھ کے بعد ان کا صحیح نقطہ نظر سامنے آ

جائے - یہ محض ایک طالب علمانہ درخواست ہے -

میری دوسری درخواست یہ ہے کہ کیا یہ ممکن نہیں کہ دین کے غلبے کے لئے جو مختلف شخصیتیں اور جماعتیں کام کر رہی ہیں وہ اپنے اپنے اختلافات پر قائم رہتے ہوئے بھی ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کریں تاکہ ان کی انفرادی کاوشوں کا مجموعی نتیجہ غلبۂ دینِ حق کی صورت میں ظاہر ہو - اگر اس پر اتفاق ہو تو شاید ایسی صورت بھی نکل آئے کہ ایک دوسرے سے تعرّض کئے بغیر تمام جماعتیں اپنا اپنا کام دلجمعی سے کرتی رہیں - یہ ایک انتہائی سادہ سی معصوم سی خواہش ہے مگر اس کا پورا ہونا شاید اتنا ہی مشکل ہے -

---

بقیہ: "قرآنِ حکیم قرنِ اوّل میں اور اس کے بعد" — ایک بلیغ اشارہ

متصوّفانہ مراقبہ کے بجائے تعمیرِ خودی کا درس دینا ضروری ہے مگر یہ بات بھی ذہن نشین کرنا ہو گی کہ جہاد فی سبیل اللہ کے نبوی طریق کار کے مطابق ہمہ جہت تبدیلی اور ہمہ گیر انقلاب کے لئے مکمل تیاری کرنا ہو گی - صرف "ابلاغ قرآنی" کے فن کو زندہ و متعارف کرا چھوڑنا کافی ہے - زمانہ تو قیامت کی چال چل چکا ہے' اس لئے ہمیں بھی قیامت کی چال چلنا ہو گا' قیام قیامت کے لئے صور اسرافیل کی آواز تک اگر اسلام کی تعمیر و آبیاری کا ایک پودا لگانے کی بھی مہلت مل جائے تو کم سے کم لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَہَا کی منزل پر تو بندۂ مومن پہنچ ہی جائے گا' ان شاء اللہ!

قرآن حکیم کی مقدّس آیات اور احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے اشاعت کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

ڈاکٹر طاہر سعید کے نام (۶)

ڈاکٹر محمد مقصود

دنیا کے مختلف نظاموں کا ایک جائزہ

(گزشتہ سے پیوستہ)

معاشرتی اور سماجی سطح پر: یہاں پہنچ کر اسلامی دنیا کی حالت اور بھی مایوس کن اور دگرگوں ہو جاتی ہے۔ سماجی اور معاشرتی اونچ نیچ کا وہ جسدِ فاسد و غلیظ جسے اسلام نے آکر قبر کی عمیق و اتھاہ گہرائیوں میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سُلا دیا تھا مغربی کرگسوں کی تقالی میں مشرقی مسکینوں نے اسے بڑی دھوم دھام کے ساتھ کھوج کرید کر نکال باہر کر دیا۔ آج معاشرتی سطح پر جتنی بڑی بے انصافی اس نام نہاد اسلامی دنیا اور خود ہمارے ملک کے اندر موجود ہے اسے دیکھ کر واقعہ یہ ہے کہ آنکھوں سے خون ہی خون ٹپکنے لگتا ہے۔ کہاں صدیقؓ و بلالؓ اور عثمانؓ و یاسرؓ کی شکل میں مساواتِ انسانی کی وہ بلند پروازی اور کہاں انسانیت کے مابین اونچ نیچ کی یہ تفریقِ خبیث۔ اپنی ہی مملکتِ خداداد پاکستان کی سماجی و معاشرتی فضا میں ایک لمحے کے لیے ذرا جھانک کر دیکھئے تو ایک انتہا پر سرمایہ داروں، سیٹھوں، وڈیروں اور جاگیرداروں کا جھرمٹ ہے جو اپنے مال و دولت کے نشے میں سرمست، اپنے شراب و کباب کی محفلوں میں مگن اور اپنی عیش پرستیوں اور رنگ رلیوں میں ہمہ تن مستغرق ہیں۔ ہزاروں روپے کا ایک ایک کتا اور ایک ایک کھلونا خرید کر اپنے بے لگام اور منہ زور جوشِ شوق کی جس اندھا دھند بندگی اور بدترین غلامی کا طوق انسانوں کے بھیس میں ان خونخوار درندوں اور بھوکے بھیڑیوں نے اپنے گلے میں پہن رکھا ہے اور پھر ایک ایک کتے کے لیے دریوں، قالینوں اور کھانوں کی شکل میں بود و باش اور خورد و نوش کا جو سامانِ عیش و نشاط ان فطرت بیزار اور انسانیت دشمن حیوانوں اور چوپایوں کے ہاں بکثرت دستیاب ہے ... ایسے ایک ایک کتے کا خرچ یہاں بیسیوں بے کسوں، غریبوں اور نادروں کی پوری زندگی کے بجٹ سے کسی طرح کم نہیں۔ عوام کے گاڑھے پسینے کی لاکھوں روپے کی کمائی بیرونِ ملک میں اُن کی ایک دن کی شاپنگ (SHOPPING) کے لیے نہایت قلیل اور ان کے کسی ایک تاج محل کی تعمیر

کے لیے بالکل ناکافی ہے۔

بالکل ایک دوسری انتہا پر وہ نومید و مسکین اور محکوم و مقہور لوگ ہیں جو ان آقاؤں اور مجازی خداؤں کی نظر میں انسان تو خیر ویسے بھی نہیں، سور و خنزیر سے بھی کسی طرح برتر نہیں۔ ظلم و استبداد کے بے لچک شکنجوں میں کسے ہوئے یہی وہ بدنصیب لوگ ہیں جو روز صبح سے لے کر شام تک اینٹیں ڈھو ڈھو کر اور پتھر تراش تراش کر ان سفاک و بے رحم اور ظالم و جبار آقاؤں کی جوتیاں سیدھی کرتے، ان کے بالوں میں مانگ نکالنے اور ان کے بلند و بالا محلات تعمیر کرتے کرتے آرزو اور انتظار کی کشاکش میں اپنی عمر دراز کی دو چار گھڑیوں پر مجبوری اور بے بسی کا ماتم کر رہے ہیں۔ اور "مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے" کے مصداق اپنے تن بے گور و کفن اور لاشۂ بے جاں کے لیے دو گز کفن کا ٹکڑا بھی فراہم نہیں کر سکتے۔ اُن کی بیویاں تو ہیں مگر مصائب و آلام اور امواجِ حوادث کے سنہ توڑ طمانچوں اور ظلم و بربریت کی بادِ صرصر کے ناگہانی تھپیڑوں کے سامنے لڑکھتے ہوئے بے بس کھلونوں سے زیادہ کی حیثیت نہیں رکھتیں۔ ان کے بچے تو ہیں مگر کولہو کے بیلوں اور باربرداری کے اونٹوں سے زیادہ کی وقعت نہیں رکھتے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ کون بے سہارا ہیں؟ جن کی موجودگی نے کائنات کے اندر آسمان کے نیچے اور سینۂ دھرتی کے اوپر بے اطمینانی کی ہلچل مچا رکھی ہے؟ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ شاہوں کے مقبروں سے کوسوں دور شہرِ خموشاں اور گورِ غریباں کے زندگی بھر ستائے ہوئے بدقسمت مکین ہیں۔

بقیہ : کاروانِ حدیث

۱۔ ابن کثیر..... البدایہ والنہایہ، ج ۱۱، ص ۱۴۹،

۲۔ سیوطی، تدریب الراوی ص ۳۱،

۳۔ عبدالرحمان مبارک پوری، مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۱۶۳،

۴۔ شاہ عبدالعزیز، بستان المحدثین ص ۶۷

۵۔ احمد بن خلکان، وفیات الاعیان ج ۳، ص ۳۴۵،

۶۔ ذہبی، تذکرۃ الحفاظ ج ۳، ص ۹

۷۔ سبکی، طبقات الشافعیہ ج ۲، ص ۳۲۲،

۸۔ ذہبی، تذکرۃ الحفاظ ج ۲، ص ۲،

۹۔ عبدالرحمان مبارک پوری، مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۶۴،

۱۰۔ ضیاء الدین اصلاحی تذکرۃ المحدثین ج ۱، ص ۴۱۰،
۱۱۔ ذہبی تذکرۃ الحفاظ ج ۳، ص ۱۳۴،
۱۲۔ تقی الدین سبکی، طبقات الشافعیہ ج ۲، ص ۱۴۱،
۱۳۔ تقی الدین سبکی، طبقات الشافعیہ ج ۲، ص ۱۴۱،
۱۴۔ شاہ عبدالعزیز دہلوی، بستان المحدثین
۱۵۔ ابن کثیر، البدایہ والنہایہ ج ۱، ص ۲۵۹،
۱۶۔ ابن حجر عسقلانی، لسان المیزان ج ۵، ص ۱۱۴،
۱۷۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، حجۃ اللہ البالغہ ج ۱، ص ۱۰۷،
۱۸۔ عبدالحی بن العماد الحنبلی، شذرات الذہب ج ۳، ص ۱۱۶،
۱۹۔ ذہبی، تذکرۃ الحفاظ ج ۳، ص ۱۲۶،
۲۰۔ احمد بن خلکان، وفیات الاعیان ج ۱، ص ۳۸۳، ابن جوزی، المنتظم ج ۷، ص ۵۴،
۲۱۔ شاہ عبدالعزیز دہلوی، بستان المحدثین ص ۵۵،
۲۲۔ ذہبی، تذکرۃ الحفاظ ج ۳، ص ۱۲۶،
۲۳۔ ابن جوزی، المنتظم ج ۷، ص ۵۴،
۲۴۔ مرویات ابی ہریرۃ کی تعداد ۵۳۷۴ ہے۔ خطبات مدراس ص ۵۳۔
۲۵۔ ضیاء الدین اصلاحی، تذکرۃ المحدثین ج ۲، ص ۵۲،

صدر مؤسس مرکزی انجمن خدام القرآن اور امیر تنظیم اسلامی

ڈاکٹر اسرار احمد

کی علمی و فکری اور دعوتی و تحریکی کاوشوں کا نچوڑ

۲۸۰ صفحات پر مشتمل ایک اہم علمی دستاویز جس میں عملی خطوط کی نشاندہی بھی موجود ہے

دعوت رجوع الی القرآن

کا منظر و پس منظر

چھپ کر آگئی ہے ۔ ضرور مطالعہ کیجئے ۔ دوسروں تک پہنچائیے ۔

• سفید کاغذ • عمدہ کتابت • دیدہ زیب طباعت • قیمت مجلد ۔/۶۵ روپے • غیر مجلد ۔/۵۰ روپے

(۲)

"مسلمانوں پر قرآنِ مجید کے حقوق" کی آسان تلخیص

"قرآنِ حکیم اور ہماری ذمہ داریاں"

جس پر مؤلف کا نام بھی درج نہیں ہے تاکہ شخصی تعصب سدِّ راہ نہ ہو

فی سینکڑہ: -/۱۵۰

(۳)

علماء کرام کے لیے رمضان المبارک کا بہترین تحفہ

مولانا حمید الدین فراہیؒ

کی دو۲ معرکۃ الآراء تحقیقی تصانیف

- اقسام القرآن
- ذبیح کون ہے؟

دونوں کتابوں کے آٹھ آٹھ نسخوں کے پیکٹ: فی پیکٹ -/۵۰

(۴)

ڈاکٹر اسرار احمد

کی جملہ تصانیف اور تالیفات کا مکمل سیٹ

- جس میں بعض کتابوں کے اعلیٰ مجلد ایڈیشن بھی شامل ہیں:

کُل مالیت -/۴۵۶ —— رعایتی قیمت -/۳۰۰

- جس میں تمام کتابوں کے عام غیر مجلد ایڈیشن ہی شامل ہیں:

کُل مالیت -/۳۱۴ رعایتی قیمت -/۲۰۰

المعلن: ناظم مکتبۂ مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور

APRIL 1990 Regd No. L. No. 8193

MONTHLY
HIKMAT_E_QURAN
LAHORE

VOL. 9
NO. 4

ماہنامہ میثاق کے ۶۸-۱۹۶۷ء کے اداریوں پر مشتمل

ڈاکٹر اسرار احمد

کی ایک اہم تالیف:

اسلام اور پاکستان

جسے بجا طور پر تحریکِ پاکستان کے تاریخی و سیاسی پس منظر اور اسلامیانِ پاکستان کے تہذیبی و ثقافتی پس منظر پر ایک جامع و مربوط دستاویز کی حیثیت حاصل ہے۔

نیا ایڈیشن، نئی خوبصورت کتابت اور دیدہ زیب طباعت کے ساتھ شائع ہو گیا ہے

قیمت: اعلیٰ ایڈیشن (مجلّد) -/۴۰ روپے اشاعتِ عام: -/۱۵ روپے

شائع کردہ

مکتبہ مرکزی انجمن خدّام القرآن، ۳۶۔ کے ماڈل ٹاؤن، لاہور